تفسیر
سورۂ فیل

سُورَةُ الفِيلِ

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــــ آیات : ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ⑴ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ⑵ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ⑶ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ⑷ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ⑸

کیا نہیں دیکھا تو نے کہ تیرے خداوند نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا کھو نہ دی ان کی چال۔ اور بھیجے ان پر چڑے فوج در فوج۔ تو پھینکتا تھا ان پر پتھر۔ آخر انھیں ایسا کر دیا جیسا کھانے کا بھس۔

۱- الفاظ کی شرح

اس سورہ میں کوئی غیر مانوس لفظ نہیں ہے، لیکن ہم تمام اہم الفاظ کی شرح کیے دیتے ہیں تاکہ ان کے اطراف و جوانب اور امور متعلقہ نظر کے سامنے آجائیں۔

۱- 'اَصْحٰبِ الْفِيْلِ' سے مراد ابرہہ اشرم کی فوج ہے۔ اس کا پورا قصہ (۶-۱۰) میں آئے گا۔

۲- 'فِيْل' واحد ہے لیکن چونکہ اس کی طرف لفظ اصحاب کو مضاف کیا گیا ہے جو جمع ہے اس وجہ سے یہاں اس لفظ سے صنف کا مفہوم سمجھا جائے گا۔ یہ استعمال عربی میں بہت عام ہے۔ مثلاً اصحب الدار، اصحب الحدیث وغیرہ۔ قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر ہے۔

ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ (مزمل، ۱۱)　　　مجھ کو اور ان خوش حال جھٹلانے والوں کو چھوڑ دے۔

اس وجہ سے یہاں یہ لفظ وحدت و کثرت دونوں کا متحمل ہے اور روایات سے دونوں ہی کی تائید ہوتی ہے لیکن کثرت کا مفہوم زیادہ لگتا ہوا ہے۔

۳- 'كَيْد' اس مخفی تدبیر کو کہتے ہیں جو مخالف کو نقصان پہنچانے کے لیے کی جائے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا (طارق ۱۵-۱۶)　　　وہ بھی چھپے ہوئے داؤ کر رہے ہیں اور میں بھی چھپے ہوئے داؤ کر رہا ہوں۔

فرعون کے قصہ میں ہے:

فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى (طٰہٰ - ۶۰)
پھر وہ اپنی تمام تدبیریں اکٹھی کرکے آیا

دوسری جگہ ہے:

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا (طٰہٰ - ۶۴)
تم اپنی تمام تدبیریں اکٹھی کرلو۔ پھر متحد ہوکر آؤ۔

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْــًٔـا (آل عمران)
ان کی مخفی تدبیریں تمھیں ذرا بھی گزند نہ پہنچا سکیں گی۔

نابغہ کہتا ہے:

یقودھم النعمان منہ بمحصف　　　وکید یغم الخارجی منماجد

(نعمان ایسی محکم رائے اور ٹھوس تدبیر سے ان کی قیادت کرتا تھا جو زور آور حریفوں کو بھی زیر کرلے)

زہیر بن ابی سلمیٰ بادشاہ سنان کی مدح میں کہتا ہے۔

لہ نقب لباغی الخیر سھل　　　وکید حین تبلوہ متین

(طالب خیر کے لیے اس کا نام لطف و کرم ہے۔ اور اگر تم اس کو آزماؤ تو اس کی تدبیر نہایت محکم پاؤگے)

کید متین یعنی ٹھوس تدبیر۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ
میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں بیشک میری تدبیر نہایت محکم ہے۔

اسی طرح 'کید' کی طرف ضعف و وہن کی بھی نسبت کی جاتی ہے۔ مثلاً

وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ (الانفال)
بے شک اللہ کافروں کی تدبیر کو کمزور کردے گا۔

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا
بے شک شیطان کی تدبیر نہایت پھس پھسی ہوتی ہے۔

بعض جگہ اس کے لیے "ضلال" (کھوجانا) "تباب" (ڈھ جانا) اور عدم ھدایت (کامیاب نہ ہونا) کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ تفصیلات آگے آتی ہیں۔

۴۔ "تضلیل" اضلال کا مبالغہ ہے۔ مصدر یہاں صیغۂ مجہول کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہاتھی والوں کی تدبیر اکارت گئی۔ اسی وجہ سے 'کید' کے لیے 'ضلال' (کھوجانا) اور عدم ہدایت کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ (یوسف ۵۲)
اور اللہ تعالیٰ بدعہدوں کی تدبیر کو بامراد نہیں کرتا۔

کعب بن زہیر کہتے ہیں:

ان الامانی والاحلام تضلیل

آرزوئیں اور تمنائیں سب اکارت ہیں

۵۔ "فِيْ تَضْلِيْلٍ" کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے جو داؤ چلایا وہ بالکل غلط پڑا۔ یہی حقیقت دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر ہوئی ہے۔

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ (غافر - ۳۷)
اور فرعون کی ساری چالیں بیکار ہی گئیں۔

لفظ "تباب" نے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے، یعنی ساری تدبیریں اکارت گئیں، ایک تیر بھی نشانہ پر نہیں لگا۔ یہی حقیقت زیادہ واضح لفظوں میں یوں بیان ہوئی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (ابراہیم - ۱۸)
کافروں کے اعمال کی مثال یہ ہے کہ راکھ کا ڈھیر ہو جس پر آندھی والے دن میں تند ہوا چل جائے اور سب اڑا لے جائے ان کی کمائی میں سے ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا یہی حقیقی محرومی ہے۔

۶۔ "اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ" حرف عَلیٰ میں یہاں غلبہ اور ضرر دونوں کا مفہوم پنہاں ہے۔ مثلاً

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا (القمر - ۱۹)
اور ہم نے ان پر تیز و تند آندھی مسلط کردی۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ (مریم - ۸۳)
ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ دیا۔

عام بول چال میں کہتے ہیں۔ ارسل الکلب علی الصید (کتے کو شکار پر چھوڑ)

۷۔ "الطیر" اکثروں کے نزدیک رکب و صحب کی طرح اسم جمع ہے، لیکن میرے نزدیک اسم صنف ہے کیونکہ اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے۔ قرآن میں حضرت عیسیٰ کی زبانی منقول ہے۔

اِنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۴۹)
میں تمہارے لیے چڑیا کی شکل کی ایک مورت بناؤں گا پھر اس میں پھونک ماروں گا اور وہ اللہ کے حکم سے زندہ چڑیا بن جائے گی۔

جب اس سے مراد جمع ہوگی تو اس کا اطلاق ان گنت چڑیوں پر ہوگا اور بمقابلہ جمع کے کثرت کا مفہوم اس سے زیادہ نمایاں ہوگا۔ مثلاً:

وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً (ص - ۱۹)
اور چڑیاں جھنڈ کی جھنڈ

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰۗفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ (الملک ۱۹)
وہ اپنے اوپر فضا میں چڑیوں کے جھنڈ نہیں دیکھتے! جو قطار در قطار پروں کو پھیلائے ہوئے اڑ رہی ہیں اور کبھی پروں کو سمیٹ لیتی ہیں سو ہاں ان کو خدائے رحمٰن ہی تھامے ہوئے ہے

۸۔ 'ابابیل' جمع ہے۔ اس لفظ کی واحد نہیں ہے۔ بعضوں نے اس کو ابالۃ کی جمع بتایا ہے۔ عموماً یہ لفظ گھوڑوں کی جماعت اور چڑیوں وغیرہ کے جھنڈ کے لیے بولا جاتا ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کا شعر ہے:

وبالفوارس من ورقاء قد علموا　　　فرسان صدق علی جرد ابابیل

(اور ورقا کے ایسے شہسواروں کے ساتھ جو اصیل غول در غول گھوڑوں پر سوار تھے اور جن کی شجاعت مسلم تھی)

اعشیٰ کا شعر ہے۔

طریق وجبار رواء اصولہ　　　علیہ ابابیل من الطیر تنعب

(کھجوروں کے چھوٹے اور بڑے درخت جن کی جڑیں سیراب تھیں اور جن پر کوؤں کے غول چیخ رہے تھے)

۹- "الحجارۃ" لوگوں نے اس کو حجر کی جمع بتایا ہے، لیکن میرے نزدیک یہ اسم منف ہے۔ قرآن مجید میں مشرکین کی زبانی منقول ہے:

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال)

اور یاد کرو جب انھوں نے کہا۔ اے رب اگر یہی بات تیرے ہاں سچ ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ (الاسراء ۵۰-۵۱)

کہہ دو سنگ یا آہن بن جاؤ یا کوئی اور مخلوق جو تمھاری نظر میں ان سے بھی زیادہ سخت ہو۔

اعشیٰ کا شعر ہے:

وحوادث الایام لا　　یبقی لها الا الحجارة

(حوادث روزگار کے مقابلہ میں صرف پتھر ہی باقی رہ سکتے ہیں)

۱۰- "سجیل" دو فارسی لفظوں سنگ (پتھر) اور گل (مٹی) سے معرب ہے۔ لوط علیہ السلام کے قصہ میں جہاں یہ لفظ وارد ہے، قرآن مجید نے دو طریقوں سے اس کی شرح کی ہے۔ ایک جگہ ہے (وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ) سجیل کے قسم کے کنکر۔ دوسری جگہ ہے (بِحِجَارَةٍ مِّنْ طِيْنٍ) چونکہ یہ لفظ لغت عرب میں شامل ہو چکا تھا، اس وجہ سے قرآن نے اس کو استعمال کیا۔ اس سورہ میں قافیہ کی مناسبت کے سبب سے طین کی جگہ سجیل رکھا۔

۱۱- "كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ" عصف، جو گیہوں وغیرہ کے پتوں اور خشک اور ریزہ ریزہ ڈنٹھلوں کو کہتے ہیں۔ ماکول، وہ شے جو کھائی جائے۔ کسی شے کا نام اس کے انجام کے اعتبار سے رکھنا عربی زبان کا عام اسلوب ہے۔ یہاں وہی اسلوب ملحوظ ہے۔ مثلاً

لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (الانفال - ۴۲)　تاکہ اللہ اس کام کو کر دے جو کرنے کا تھا۔

"اصحٰب فیل" کو "عصف ماکول" سے اس لیے تشبیہ دی کہ اس جنگ میں ان کو ایسی شکست ہوئی کہ ان کی تمام طاقت پارہ پارہ ہو گئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان کی حکومت کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔

یہ تشبیہ عربی زبان میں مستعمل ہے۔ عدی بن زید اپنے مشہور قصیدہ میں کہتا ہے۔

ثم صاروا كانهم ورق جف　　فالوت به الصبا والدبور

(پھر وہ خشک پتیوں کے مانند ہو گئے جن کو پروا اور پچھوا ہوا اڑائے لیے پھرتی ہے)

قرآن مجید میں ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ

اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو کہ جیسے آسمان سے ہم نے پانی اتارا اور زمین کی نباتات اس سے سیراب ہو کر خوب اگیں۔ پھر وہ خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو گئیں

الرِّيٰحُ (الکہف)　جن کو ہوائیں ادھر ادھر اڑائے لیے پھرتی ہیں۔

پرانے صحیفوں میں بھی یہ تشبیہ استعمال ہوئی ہے۔ ہوسیع باب ۱۳، آیتہ ۳ میں ہے:

"اس لیے وہ صبح کے ابر کے مانند ہوں گے اور اس اوس کے مانند جو سویرے جاتی رہتی ہے اور بھوسی کی طرح جو بگولے کے ساتھ کھلیان پر سے اڑائی جاتی ہے اور اس دھوئیں کے مانند ہوں گے جو دود کش سے نکلا جاتا ہے۔"

اس تاریخی حقیقت سے اس تشبیہ کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے کہ ابرہہ کے آدمیوں کے اعضا میدان میں بکھرے ہوئے پڑے تھے اور چڑیاں ان کو نوچ نوچ کر کھاتی تھیں۔ تفصیلات آگے آتی ہیں۔

۴- اس سورہ کا مخاطب کون ہے؟

عمود اور نظم پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سورہ کے مخاطب کو متعین کر لیا جائے، تاکہ صحیح تاویل صحیح نظم اور موقع و محل کے محاسن کو سمجھنے کی راہ کھل سکے۔

ہمارے نزدیک اس سورہ کے مخاطب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا تھا یا اس کو بطریق تواتر سن کر اس پر یقین رکھتے تھے۔ یہ زبان کا ایک مخصوص اسلوب ہے جس میں واحد کا اطلاق جمع پر ہوتا ہے۔ گویا واحد کا لفظ ایک ایک کر کے پوری جماعت کو مخاطب کرتا ہے۔ کلام عرب اور قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ تورات میں جہاں کہیں بنی اسرائیل کو واحد کے صیغہ سے خطاب کیا ہے، وہاں یہی اسلوب ملحوظ ہے اور واحد کے صیغہ سے پوری قوم کو مراد لیا ہے۔[1] مفصل بحث کتاب الاسالیب میں ملے گی۔ یہاں ہم صرف قرآن مجید سے بعض مثالیں نقل کریں گے۔ فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ (لقمان - ۳۱)

نہیں دیکھتے کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ کے فضل سے تاکہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔

اس آیت میں کلام، واحد کے صیغہ (اَلَمْ تَرَ) سے شروع ہوا لیکن پھر (لِيُرِيَكُمْ) میں جمع کی ضمیر آگئی ہے۔ کیونکہ واحد سے مقصود درحقیقت جمع ہی ہے۔

دوسری جگہ ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ (ابراہیم - ۱۹)

نہیں دیکھتے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا، اگر وہ چاہے تو تمہیں فنا کر دے اور تمھاری جگہ نئی مخلوق بسائے۔

اس آیت میں بھی وہی اصول ملحوظ ہے۔

کبھی اس کے برعکس جمع سے کلام شروع ہوتا ہے اور پھر واحد کی ضمیر آجاتی ہے لیکن اس سے مقصود وہی جمع ہوتی ہے۔ مثلاً

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (البقرہ - ۱۰۴)　اے ایمان والو "راعنا" مت کہو بلکہ "انظرنا" کہو۔

[1] افسوس ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب نہ اصل عربی ہی میں اب تک شائع ہو سکی اور نہ اس کا ترجمہ ہی شائع ہو سکا۔ (مترجم)

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (البقرہ ۲- ۱۰۶-۱۰۷)

کیا نہیں جانتے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے کیا نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی یار و ناصر نہیں ہے۔

دیکھو خطاب جمع کے صیغہ (لَا تَقُوْلُوْا) سے شروع ہوا، پھر واحد (اَلَمْ تَعْلَمْ) کا صیغہ آ گیا اور اس کے بعد (وَمَا لَكُمْ) میں پھر جمع کی ضمیر آ گئی۔

ایک جگہ ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ. تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ. يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ. وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ. اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ. (الشعراء ۲۲۱-۲۲۵)

میں تمھیں بتاؤں شیاطین کن پر اترتے ہیں؟ وہ لپاٹیوں اور گنہ گاروں پر اترتے ہیں۔ وہ کان لگاتے ہیں حالانکہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور شعراء کی پیروی تو گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

کلام شروع ہوا (اُنَبِّئُكُمْ) ضمیر خطاب جمع سے، پھر (اَلَمْ تَرَ) واحد کا صیغہ آ گیا۔

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف - ۱۹۸)

اگر تم انھیں ہدایت کے لیے بلاؤ گے نہیں سنیں گے، تم خیال کرتے ہو کہ وہ تمھاری طرف تاک رہے ہیں، حالانکہ ان کو کچھ نہیں سوجھتا۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۲۱، ۴۰) میں واحد سے جمع اور جمع سے واحد کی طرف منتقل ہونے کی ایک سے زیادہ مثالیں موجود ہیں اور وہاں ایسے واضح قرینے بھی موجود ہیں کہ کسی طرح پیغمبر صلعم کی طرف خطاب کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آیت ذیل بھی اسی سلسلہ میں وارد ہے، جس کے بعد اس قسم کے شبہ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (الاسراء - ۲۳)

تمھارے رب نے فیصلہ کر دیا کہ اس کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمھارے سامنے بوڑھے ہو جائیں تو ان کو بار سمجھ کر اُف نہ کہنا اور نہ کسی بات پر ان کو جھڑکنا بلکہ شریف بیٹے کی طرح دل جوئی کی باتیں کرنا۔

ممکن ہے تمھارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ، یہ بات اپنی جگہ پر ٹھیک ہی سہی، لیکن جب مشہور یہی ہے کہ سورہ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ میں روئے سخن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور یہاں کوئی چیز اس بات کو ماننے سے مانع بھی نہیں ہے تو ایک

مشہور بات چھوڑ کر اس کا مخاطب ایک جماعت کو کیوں سمجھا جائے؟ اس سوال کے جواب کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھنے چاہییں۔

۱- "اَلَمْ تَرَ" کا استعمال زیادہ تر عام خطاب کے لیے ہے۔ بغیر کسی قرینہ کے اس کو خاص خطاب کے مفہوم میں لینا اس کے عام استعمال کے خلاف ہے۔ یہاں واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ جن لوگوں نے واقعہ کا مشاہدہ کیا ہے انھی کو مخاطب مانا جائے۔ اوپر جو مثالیں گزر چکی ہیں ان سے صاف ثابت ہے کہ عربی میں واحد حاضر کا صیغہ جمع کے لیے عام طور پر استعمال ہے۔ ہم نے بقصد اختصار صرف چند مثالیں ذکر کی ہیں، ورنہ اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ، چونکہ قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے، اس وجہ سے اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو کم از کم کسی کلام کی ابتدا میں خطاب پیغمبر ہی سے ہونا چاہیے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید جس طرح سلسلہ کلام میں عام لوگوں کو مخاطب کرتا ہے، اسی طرح ابتدائے کلام میں بھی عام خطاب سے دعوت دیتا ہے۔ مثلاً اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ (تم تفاخر دولت میں بھولے رہے) "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ" اے لوگو! (اس خطاب سے دو سورتیں شروع ہوئی ہیں) اسی طرح سلسلہ کلام میں "فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى" اور "فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" والی آیتیں وارد ہیں۔ خصوصاً موخر الذکر بار بار دہرائی گئی ہے اور اگر حسن تاویل کو نگاہ میں رکھا جائے تو بہت سی آیتوں میں، جہاں لوگوں نے آنحضرت صلعم کو مخاطب مانا ہے، عام خطاب ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً "فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ" (سوا ب کیا ہے جس سے تو جزا کو جھٹلاتا ہے) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ (اور تو نے اس کھٹکھٹانے والی کو کیا سمجھا؟) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ (اور تو نے کیا سمجھا ہے کہ وہ کیا ہے؟) الغرض جب قرآن نے عام انسانوں یا مخاطب جماعت کو حسب موقع واحد، جمع، مثنیٰ کے صیغوں سے اکثر مخاطب کیا ہے تو تعیین خطاب میں، اصول کی حیثیت سے حسن تاویل ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اس سورہ کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکہ اور اہل مکہ کی، ان کے دشمنوں کے مقابل میں برابر حمایت کرتا رہا ہے۔ استفہام یہاں جیسا کہ ظاہر ہے، زجر و تنبیہ کے لیے ہے۔ اس وجہ سے اس کا خطاب ایسے ہی لوگوں کی طرف ہو سکتا ہے جنھوں نے زیر سوال واقعہ کے نتائج و عواقب پیش نظر رکھنے میں غفلت کی ہو۔ گویا ان کو ایک سمجھی بوجھی ہوئی حقیقت کو نظر انداز کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے کہ تم آگاہ ہونے کے باوجود اس قسم کی غفلت کے مرتکب کیوں ہوتے ہو؟ اس فصل میں اوپر جو آیتیں مذکور ہوئی ہیں ان میں "اَلَمْ تَرَ" اور "اَلَمْ تَعْلَمْ" وغیرہ میں زجر و تنبیہ کا پہلو بالکل نمایاں ہے۔ پھر ایسی صورت میں روئے خطاب پیغمبر صلعم کی طرف کیوں کر ہو سکتا ہے۔ جب کہ سورہ میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی اس بات کا نہیں ہے کہ آپ سے اس معاملہ میں کوئی چوک ہوئی ہو جس پر تنبیہ کی ضرورت ہو؟ البتہ اہل مکہ کی طرف خطاب ہو سکتا ہے۔ وہ اولاً تو بت پرستی کرتے تھے۔ ثانیاً مسلمانوں کو نماز سے روکتے تھے جو کفران نعمت الٰہی کا سب سے زیادہ بدنما مظاہرہ ہے۔ چنانچہ بعد کی سورہ میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو گئی ہے۔ اس سورہ کے مضمون کے ساتھ اگر بعد والی سورہ کا مضمون بھی ملا لو تو گویا پوری بات یوں ہو گی کہ تم اس گھر کے رب کی پوجا کیوں نہیں کرتے اور شرک و بت پرستی چھوڑ کر صرف اس ایک ہی پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے جس نے تم کو تمھارے دشمنوں سے مامون کیا اور ہر موقع پر تمھاری مدد فرمائی؟

۳۔ اگر مخاطب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا جائے تو لازماً اس میں تسلی کا مفہوم لینا ہوگا کہ جس طرح خدا نے اس گھر کے پہلے دشمنوں کو شکست دی ہے، اسی طرح ان موجودہ دشمنوں یعنی مشرکین کو بھی برباد کرے گا۔ یہ مفہوم لینے میں اگرچہ روئے خطاب تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح ہو جاتا ہے لیکن قرآن مجید لوگوں کو سنانے کے لیے اتارا گیا ہے۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ (اور ہم نے قرآن کو جستہ جستہ کرکے اتارا تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ) اس وجہ سے جب آنحضرت صلعم اس کو قریش کو سناتے تو وہ اس سے الٹے اپنی تائید میں دلیل لاتے کہ اگر یہ بات ہے تو ہم خدا کی مدد و نصرت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ہم خانہ کعبہ کے متولی ہیں اور سورہ سے خود ثابت ہے کہ خدا نے ہمارے دشمنوں کے مقابل میں ہماری مدد فرمائی اور ان کو پامال کیا ہے۔ اس لیے تہدید کا پہلو اختیار کرنے میں آیت کی تاویل بہتر نہیں ہوگی۔ بہتر تاویل اسی صورت میں ہوگی کہ اس کو تشویق و ترغیب کے مفہوم میں لیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات یاد دلاکر انھیں اتباعِ توحید پر ابھارا ہے۔ بعد والی سورہ میں اس کی تصریح ہے، اس وجہ سے لازماً مخاطب انھی کو ماننا پڑے گا۔

۴۔ مابعد سورہ کا ربط بھی اسی کا تقاضا کر رہا ہے کہ مخاطب قریش ہی کو مانا جائے۔ اگلی فصل میں اس کی تفصیل آئے گی۔

بہرحال گزشتہ تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس سورہ میں مخاطب آنحضرت صلعم نہیں بلکہ قریش ہیں۔ اور واحد کے صیغہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ قریش کے ایک ایک فرد کو مخاطب کرکے اس کی ذمہ داری یاد دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار رہے، اس کو ہر وقت یاد رکھے اور جس طرح بندہ اپنے منعمِ حقیقی سے ڈرتا ہے، اسی طرح اس سے ڈرے اور اس کی بندگی کرے۔ بعد والی سورہ میں اس کی پوری تصریح ہے۔ ان وجوہ سے ضروری ہے کہ 'ترٰی' میں ضمیرِ خطاب کا مخاطب انھی کو سمجھا جائے۔

۳۔ سورہ کا عمود اور ماقبل و مابعد سے تعلق

سابق سورہ (سورہ ہمزہ) میں ایک عیب جو اور اشارہ باز کا ذکر ہے، جو اپنے انجام سے غافل اور مال و جاہ کی لذتوں میں سرمست ہے۔ اس کو خبر دی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو کے رہے گا اور اپنے تمام سامانِ عیش کے ساتھ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ اور چور چور کر دینے والی جہنم میں پڑے گا۔

اس سورہ میں بطور ایک تاریخی شہادت کے ان لوگوں کی تباہی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو قوت کے گھمنڈ اور دولت کے نشہ میں، اللہ کے مقدس گھر پر چڑھ دوڑے اور اس کے قہر و غضب کی پروا نہ کی حالانکہ اس عظیم الشان گھر کی عظمت سے وہ اپنے مذہبی صحیفوں کے ذریعہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہود کی دشمنی میں انھوں نے اس طرح کی جسارت مسجد بیت المقدس کے ساتھ بھی کی تھی اور یہود نے بھی جوشِ عناد سے اندھے ہو کر اسی طرح کی گستاخیاں کی تھیں۔ یہاں ان تفصیلات میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔

خدا نے اسی مغرور دولت مند کو یہ تاریخی واقعہ یاد دلایا ہے جس کا ایک قریشی اور باشندہ مکہ ہونے کی وجہ سے وہ ایک عینی شاہد بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ ابولہب کی طرف ہوگا کیونکہ اسی کی اور اس کے پیرؤوں کی بدعتوں ہی

نے بیت اللہ کی حرمت برباد کی۔ اس کے کفر و فسق اور اس کی زر پرستی اور طمع کی تفصیل تفسیر سورہ اللہب میں آئے گی۔ اس کو مخاطب کرکے خداوند تعالیٰ نے یاد دلایا ہے کہ دیکھ! تیرے جیسے شریروں اور مغروروں کے سر خدا نے کس طرح کچلے، ان کی ساری قوت کس طرح پامال کر ڈالی، یہ مقدس گھر جو قریش کی عظمت اور ان کے امن و رزق کا ضامن ہے، ان کی نجاستوں سے پاک کیا گیا۔ پھر خیال کرو، تم نے اپنے زورِ بازو سے ان کو مغلوب نہیں کیا بلکہ اس کے لیے اس خدا کی تلوار بے نیام ہوئی جو اس گھر کا محافظ ہے۔ خدا نے ان کے دلوں میں اپنا رعب ڈالا اور ان کو ایسی کنکریوں سے سنگسار کیا جن کے زخموں نے ان کے جسموں کو گھلا ڈالا۔ تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے ان کی لاشوں کے انبار دیکھے، پھر خدا نے ان پر جھنڈ کی جھنڈ چڑیاں بھیجیں جنھوں نے عظیم الجثہ ہاتھیوں اور سربلند بادشاہوں کی لاشوں کا گوشت نوچا اور تمھاری مقدس وادی کو بدبو سے پاک کیا اور تم کو ایک بڑی زحمت سے بچا کر اپنے جلالِ قدرت کی ایک دوسری نشانی کا مشاہدہ کرایا۔ نعمت و نقمت کی حیرت انگیز مثالوں کے بعد خدا کی نافرمانی اور اس کے شعائر کی توہین کی جرأت کیسے کرتے ہو؟

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ چڑیوں نے ان کی لاشوں کو کھایا تو یہ بات تفصیل طلب ہے۔ اس کے لیے دیکھو فصل (۹-۱۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس سورہ میں خدا کی نذرِ شکر گزاری کا فرض یاد دلانے کی تمہید ہے۔ یعنی اللہ کے مقدس گھر کی برکت سے، اہلِ عرب کو عموماً اور اہلِ مکہ کو خصوصاً، عزت و عظمت اور امن و رزق کی جو نعمتیں حاصل ہیں، ان کو یاد دلاکر ان کی شکر گزاری کا فرض یاد دلایا گیا ہے۔ گویا یہ پوری سورہ صرف نعمتوں اور برکتوں کے بیان میں ہے، اس کے بعد کیا ہونا چاہیے؟ اس سوال کا جواب یہ سورہ نہیں دیتی۔ بعد والی سورہ مستقلاً اسی سوال کے جواب میں ہے۔ جس میں فرمایا گیا ہے فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ (پس چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں)۔

اس نعمت کے بیان کے لیے ایک سورہ مخصوص کی گئی تاکہ جس نعمت نے ان کو تمام عالم حتیٰ کہ بنی اسرائیل پر بھی فوقیت بخشی، اس کی قدر و قیمت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔ بنی اسرائیل کو تمام شرف و امتیاز کے باوجود قتل اور قید کی تمام تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا حتیٰ کہ یروشلم اور مقدس ہیکل دونوں ان کے ہاتھ سے چھن گئے اور بری طرح برباد ہوئے، لیکن خدا کا یہ مقدس گھر ہمیشہ محفوظ رہا۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

لیکن یہ فضیلت ہمیشہ خدا کے علم و حکمت کے تحت حاصل ہوتی ہے، اس وجہ سے اس پر مغرور ہونے کے بجائے خدا کا ہی شکر گزار ہونا چاہیے۔

اب ہم چند سطروں میں اس فضیلت کے اسباب و وجوہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ اس کی حکمت واضح ہو سکے۔

۴۔ خانہ کعبہ اور بنی اسمٰعیل کے فضائل و خصوصیات

قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں پچھلی قوموں کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے عدل و حکمت کی بے شمار نشانیاں پنہاں ہیں۔ ان پر غور کرنے سے مکہ اور اہلِ مکہ، یروشلم اور اہلِ یروشلم کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے چند ہم یہاں بیان کرتے ہیں اور اس بحث میں ہم زیادہ تر تورات سے استدلال کریں گے تاکہ ہمارے نتائجِ بحث اہلِ کتاب پر

حجت ہو سکیں۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خانۂ کعبہ دین الٰہی کی اصل و اساس ہے۔ یہ پہلا گھر ہے جو دنیا میں توحید اور غربا پروری کا مرکز بنا۔ خانۂ کعبہ کی اس خصوصیت کا بیان تورات میں بھی ہے۔ اگرچہ یہود نے اس پر تحریف کے پردے ڈال دیے ہیں، لیکن صاحب نظر آج بھی اس کی جھلک تورات میں دیکھ سکتا ہے۔ مفصل بحث آیت ذیل کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (آل عمران ۹۶-۹۷)

بے شک عبادت کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر ہوا وہی ہے جو مکہ میں ہے سراپا خیر و برکت اور دنیا والوں کے لیے ہدایت اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کی سکونت، جو شخص اس میں داخل ہوا وہ مامون ہے اور لوگوں میں سے جو وہاں جا سکتے ہوں ان پر خدا کے لیے اس گھر کا حج کرنا ہے۔

اس آیت میں اس گھر کے اولین عبادت گاہ اور اس کے تعمیر ابراہیمی ہونے کی تین دلیلیں بیان فرمائی ہیں۔ پوری تشریح آیت کی تفسیر کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خدا کا پہلا گھر خدا کی حفاظت کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ وہی دین کی اصلی بنیاد ہے۔ یروشلم کی مسجد، جیساکہ تورات سے معلوم ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر ہے، اس سے پہلے یہود کے پاس کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ سلاطین باب ۸ : ۱۶ میں ہے:

"جس دن سے میں اپنے گروہ اسرائیل کو مصر سے نکال لایا تب سے میں نے سارے اسرائیلی فرقوں میں سے کسی شہر کو جس میں میرا گھر بنایا جائے اور اس میں میرا نام ہو چن نہ لیا۔"

۲۔ خانۂ کعبہ کی فضیلت کا دوسرا پہلو اس کے بانی کی عظمت ہے۔ اس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ اس کے برعکس بیت المقدس کو، جیساکہ تورات میں تصریح اور قرآن میں اشارہ ہے، پابند اور محکوم مزدوروں نے بنایا ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت جو دعا فرمائی وہ بجائے خود نہایت عظیم الشان چیز ہے۔ ان کی دعا یہ ہے :۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرۃ - ۱۲۷)

اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اس دعا کے ساتھ اونچی کر رہے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہماری دعا قبول فرما بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کے لیے امن و برکت کی دعا فرمائی اور چاہا کہ یہ امن و برکت صرف مومنین کے لیے مخصوص ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مقدس گھر کی برکتوں کو دنیا کی زندگی میں مومن و کافر دونوں کے لیے عام کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ

اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی اے پروردگار اس کو پر امن سرزمین بنا، اس کے ساکنوں کو پھلوں کی روزی دے جو ان میں سے اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائیں۔ اللہ نے فرمایا

قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (البقرۃ - ۱۲۶)

جو کفر کریں گے ان کو بھی کچھ دن (دنیا کی زندگی میں) نفع پہنچاؤں گا، پھر ان کو آگ کے عذاب کی طرف ڈھکیلوں گا اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

خانۂ کعبہ کی حرمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات پسند نہ فرمائی کہ ابراہیم کی اولاد اپنی ناشکری کی سزا اس پُرامن زمین میں پائے۔ اس کے برعکس مسجد یروشلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا وہ سلاطین (ب ۹ : ۱-۹) میں یوں مذکور ہے :

اور ایسا ہوا کہ جب سلیمان خداوند کا گھر اور بادشاہ کا قصر بنا چکا اور سلیمان کی ساری تمنا جو اس کے دل میں تھی پوری ہو چکی تو خداوند سلیمان کو دوسری بار دکھائی دیا جس طرح کہ جبعون میں دکھائی دیا تھا اور خداوند نے اس سے کہا کہ میں نے تیری دعا اور تیری مناجات جو تو نے میرے آگے کی، سنی ہے اور اس گھر کو جو تو نے بنایا کہ میرا نام ابد تک اس میں رہے مقدس کیا، سو میری نگاہ اور میرا دل سدا اسی پر رہے گا اور اگر تو میرے حضور ایسی چال چلے گا جیسی تیرا باپ داؤد دل کی راستی اور صداقت سے چلا اور ان سب حکموں پر جو میں نے تجھ سے کیے عمل کرے گا اور میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو حفظ کرے گا تو میں سلطنت کا تخت اسرائیل میں ہمیشہ قائم رکھوں گا جیسے کہ میں نے تیرے باپ داؤد سے وعدہ کیا اور کہا کہ تیرے یہاں مرد کی کمی نہ ہوگی، جو اسرائیل کے تخت پر بیٹھے، پر اگر تم یا تمہاری اولاد میری پیروی سے کسی طرح برگشتہ ہوگے اور تم میری شریعتوں اور میری عدالتوں کو جو میں نے تمہیں بتائیں، حفظ نہ کرو گے اور اجنبی معبودوں کو عبادت کرنے جاؤ گے اور انھیں سجدہ کرو گے تو میں اسرائیل کو اس سرزمین سے جو میں نے انھیں دی ہے فنا کروں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لیے مقدس کیا ہے اپنی نظر سے گرا دوں گا اور اسرائیل تمام جہان میں ضرب المثل اور انگشت نما ہوگا اور اس بلند گھر کے برابر سے جو کوئی گزرے گا حیران ہوگا اور سیٹی بجائے گا اور وہ کہیں گے خداوند نے اس سرزمین اور اس گھر سے ایسا کیوں کیا تب وہ جواب دیں گے۔ یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے خداوند اپنے خدا کو جو ان کے باپ دادوں کو زمین مصر سے نکال لایا ترک کیا اور اجنبی معبودوں کو اختیار کیا اور انھیں سجدہ کیا اور ان کی بندگی کی اس لیے خداوند نے ان پر یہ سب بلا نازل کی۔"

بعینہٖ یہی مضمون یرمیاہ ۲۲ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت اور تقویٰ کے ساتھ اگر حقیر سے حقیر چیز بھی خدا کے حضور میں پیش کی جائے تو وہ قبولیت کی عزت پاتی ہے۔ یہی حقیقت ہابیل و قابیل کے قصہ میں بھی موجود ہے۔ ہر چند ان دونوں مقدس مسجدوں کی بنیاد تقویٰ اور محبت الٰہی پر ہے، لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مسجد یروشلم قیمتی پتھروں اور سونے چاندی کی ایک تعمیر تھی جو مقہور و مجبور مزدوروں کے ہاتھوں بنی تھی (دیکھو سلاطین ب ۵-۱۲) اور اس کے برعکس بیت اللہ سادگی اور بنانے والوں کی نیازمندی کا ایک مرقع تھا۔

۳۔ خانۂ کعبہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنایا۔ اس کے لیے ان کو آبائی وطن سے ہجرت کا حکم ہوا۔ اس کی جگہ کی تعیین خود خدا نے فرمائی اور اس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عام اعلان کیا گیا کہ جو لوگ اس مقدس گھر میں الحاد اور شرک کے مرتکب ہوں گے اور اس کی حرمت کو بٹہ لگائیں گے اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کر دے گا۔ چنانچہ اصحاب فیل کے ساتھ اس نے ایسا ہی کیا۔

یہ چاروں باتیں جو قرآن مجید میں مذکور ہوئی ہیں، تورات میں اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہیں ہیں کیونکہ یہود نے ان کو نکال دیا ہے۔ تاہم کچھ مخفی اشارات باقی ہیں جو قرآن کے بیان کی تائید کرتے ہیں۔

مسجد یروشلم کا حال یہ نہیں ہے، اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے ایک عبادت گاہ بنانی چاہی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو منع فرما دیا کہ یہ کام سلیمانؑ کے ہاتھوں انجام پائے گا چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جس طرح اور جس جگہ مناسب سمجھا اس کی تعمیر کی، سموئیل ثانی (ب ۷: ۱-۱۷) میں ہے۔

اور ایسا ہوا کہ جب بادشاہ گھر میں بیٹھا تھا اور خداوند نے اسے اس کے سارے دشمنوں کی بابت ہر ایک طرف سے آرام بخشا تو بادشاہ نے ناتن نبی کو کہا دیکھیے تو میں سرو کی لکڑیوں کے گھر میں رہتا ہوں، پر خدا کا صندوق پردوں کے درمیان رہتا ہے۔ تب ناتن نے بادشاہ کو کہا کہ جا سب کچھ کہ تیرے دل میں ہے کر، خداوند تیرے ساتھ ہے اور اسی رات ایسا ہوا کہ خداوند کا کلام ناتن کو پہنچا اور اس نے کہا کہ جا اور میرے بندے داؤد سے کہہ، خداوند یوں فرماتا ہے کہ کیا تو میرے لیے ایک گھر جس میں میں رہتا ہوں بنایا چاہتا ہے؟ سو میں جب سے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لایا آج کے دن تک کسی گھر میں نہیں رہا، بلکہ خیمے میں یا مسکن میں پھرتا رہا اور جہاں جہاں میں سارے اسرائیلیوں کے ساتھ پھرتا رہا تو کیا میں نے کسی اسرائیلی فرقہ کو جسے میں نے حکم کیا کہ میرے اسرائیلی گروہ کی رعایت کرے، کہا ہے کہ تم میرے لیے سرو کا گھر کیوں نہیں بناتے؟ سو اب تو میرے بندے داؤد سے ایسا کہہ، کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے بھیڑ سالے میں سے جہاں تو بھیڑیں چراتا تھا اٹھا کے اپنی قوم اسرائیل کا حاکم کیا اور میں جہاں جہاں تو گیا تیرے ساتھ رہا اور تیرے سارے دشمنوں کو تیرے سامنے مارا اور میں نے ان لوگوں کی مانند جن کا نام دنیا میں بڑا ہے تیرا نام بڑا کیا۔ اور میں اپنی قوم اسرائیل کے لیے ایک مکان مقرر کروں گا اور وہاں انھیں لگاؤں گا تاکہ اپنے خاص مکان میں بسیں اور پھر آوارہ نہ ہوں اور شرارت کے فرزند آگے کی طرح ان کو دکھ نہ دیں گے اور نہ اس دن کی طرح جس دن سے میں نے قاضیوں کو مقرر کیا کہ میری اسرائیلی گروہ پہ حاکم ہوں اور تجھ کو تیرے سارے دشمنوں سے آرام دیا پھر خداوند تجھ کو فرماتا ہے کہ تیرے لیے گھر بھی بناؤں گا اور جب کہ تیرے دن پورے ہوں گے اور تو اپنے باپ دادوں کے ساتھ سو رہے گا تو میں تیرے بعد تیری نسل کو جو تیری صلب سے ہوگی برپا کروں گا اور اس کی سلطنت کو قائم کروں گا، وہی میرے نام کا ایک گھر بنائے گا اور اس کی سلطنت کا تخت ابد تک قائم رکھوں گا اور میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا، سو اگر وہ کوئی خطا کرے گا تو میں اسے آدمیوں کے کوڑے اور بنی آدم کے تازیانوں سے تنبیہ کروں گا، پر میری رحمت اس سے جدا نہ ہوگی، جس طرح کہ میں نے اسے ساول سے جدا کیا جس کو کہ میں نے تیرے آگے سے دفع کیا، بلکہ تیرے گھر اور تیری سلطنت ہمیشہ تک تیرے آگے قائم رہے گی، تیرا تخت ہمیشہ ثابت رہے گا، سو ناتن نے ان ساری باتوں اور اس سارے خواب کے مطابق داؤد سے کہا۔

اس کے بعد جب حضرت سلیمانؑ نے تعمیر شروع کی تو یہ وحی آئی (سلاطین ۶: ۱۱-۱۳)

اس وقت خداوند کی طرف سے سلیمان پہ کلام اترا اور اس نے کہا کہ اس گھر کی بابت جو تو بناتا ہے اگر تو میری شریعتوں پر چلے گا اور میری عدالتوں پر عمل کرے گا اور میرے احکام کو ان پہ چلنے کے لیے حفظ کرے گا تو میں اپنے سخن کو جو میں نے تیرے

باپ داؤد سے کہا ہے تیرے ساتھ پورا کروں گا اور میں بنی اسرائیل کے درمیان رہوں گا اور اپنی قوم اسرائیل کو ترک نہ کروں گا۔"

۴۔ خانہ کعبہ کمال اسلام کی تصویر ہے اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وہیں اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کی اور پھر دونوں باپ بیٹوں نے مل کر اس کی تعمیر کی اور خدا سے اس کی قبولیت کی دعا کی۔ ہر چند یہود نے تورات میں اس قصہ کو بہت کچھ بدل ڈالا ہے۔ لیکن ان کا جھوٹ بالکل آشکارا ہے۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ جہاں جہاں حضرت اسمٰعیلؑ کا نام تھا وہاں حضرت اسحٰق کا نام ڈال دیا ہے۔ سورۂ والصّٰفّٰت میں یہ بحث کسی قدر تفصیل سے گزر چکی ہے اور اس موضوع پر الرای الصحیح فی من هو الذبیح کے نام سے ہمارا ایک مستقل رسالہ بھی ہے۔[1]

۵۔ حضرت ابراہیمؑ کی جو ذریت بیت اللہ کے پڑوس میں آباد ہوئی صبر و رضا اس کے فضائل و اخلاق کا سب سے زیادہ نمایاں عنصر تھا۔ قرآن اور یہود کے صحیفے دونوں اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ ہر چند یہود کے صحیفوں کی شہادت تحریفات کی وجہ سے ناقابلِ اعتبار ہے، لیکن اتمام حجت کے لیے ہم ان سے بھی بحث کریں گے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی جو اولاد حضرت سارہؑ کے بطن سے تھی اس کو انھوں نے ایک شاداب و زرخیز زمین میں آباد کیا جس میں دودھ اور شہد کی نہریں جاری تھیں۔ اور ان کی جو اولاد حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے تھی اس کو بیت اللہ الحرام کے پاس ایک وادی غیر ذی زرع میں بسایا۔ یہود کے صحیفوں میں ان دونوں قبیلوں کی علیحدگی کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہ کے بطن سے اولاد بخشی تو حضرت سارہ کو رشک ہوا اور انھوں نے حضرت ہاجرہ کے ساتھ بدسلوکی کی، حضرت ہاجرہؑ نے یہ ذلت و تکلیف نہایت صبر کے ساتھ برداشت کی جس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو برکت دی اور اس کا فرشتہ دو مرتبہ ان سے ہمکلام ہوا۔ حضرت سارہ اس شرف سے محروم ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اور مذہبی صحیفوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ خدا کی نوازش مظلوموں اور شکستہ دلوں پر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ پیدائش (ب ۱۶: ۱۰)

پھر خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سن لیا (یعنی تیری گریہ و زاری)

پیدائش (ب ۲۱: ۱۷-۱۸) میں ہے۔

"اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس کے لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔"

ہر چند یہود نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ میں بہت کچھ جھوٹ کی آمیزش کر دی ہے، جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں، تاہم اپنی خواہش کے خلاف انھوں نے بہت سی ایسی باتوں کا اعتراف بھی کر لیا ہے جو ان کے خلاف دلیل ہیں۔

۶۔ بنی اسماعیل کی فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بنی اسحٰق کی بدسلوکیوں کے باوجود انھوں نے ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا۔ خود یہود کی روایات سے ثابت ہے کہ حضرت سارہ تحقیر کی وجہ سے حضرت ہاجرہؑ کو لونڈی کہتی تھیں اور

[1] یہ رسالہ اردو میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔ (مترجم)

یہ بری سنت ان کی اولاد میں بھی باقی رہی چنانچہ بنی اسحاق بنی اسمٰعیل کو کنیز کی اولاد کہتے تھے، حالانکہ یہ بات بالکل خلاف حقیقت تھی، بالآخر اس کا انجام یہ ہوا کہ حضرت سارہ کی اولاد مصر میں غلام ہو کر بکی۔ پیدائش (ب ۳۷ : ۲۵) میں ہے:

"وہ روٹی کھانے بیٹھے اور آنکھ اٹھائی اور دیکھا کہ اسماعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے گرم مصالحہ اور روغن بلسان اور مرہ اونٹوں پر لادے ہوئے آتا ہے کہ انہیں مصر کو لے جائیں، تب یہودہ نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اس کا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا، آؤ اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچیں اور اس پر اپنے ہاتھ نہ ڈالیں کہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا گوشت ہے اور اس کے بھائی راضی ہوئے اور اس وقت وہ مدیانی سوداگر ادھر سے گزرے سو انھوں نے یوسف کو کھینچ کر کوئیں سے باہر نکالا اور اسماعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے کو بیچا اور وہ یوسف کو مصر میں لائے۔"

اس روایت میں بھی ایک اہم بات بالکل چھپا دی گئی ہے لیکن اس وقت ہم اس کو کریدنا نہیں چاہتے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ انھوں نے حضرت یوسفؑ کو اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ یہ ان کی غلامی کی تمہید تھی۔ اس کے بعد ایرانیوں، مصریوں اور رومیوں نے یکے بعد دیگرے ان کو گرفتار کیا اور غلام بنایا۔

اس کے برخلاف حضرت ہاجرہ کی اولاد، اپنی پوری تاریخ میں کبھی غلامی کی ذلت سے آشنا نہیں ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ ان کی حفاظت فرمائی۔ بلکہ جیسا کہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ بنی اسماعیل نے اپنے اسرائیلی بھائیوں کے دشمنوں سے ان کی ذلتوں کا انتقام لیا۔ ان کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں سے خریدا اور اب ایک عرصہ سے صرف ممالک اسلامیہ ہی ان کے لیے جائے پناہ ہیں اور اگر وہ حضرت سرورِ عالم صلعم پر ایمان لائیں تو جیسا کہ قرآن مجید اور تورات دونوں میں وعدہ ہے، آخرت میں اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام ہوگا اور الحمد للہ اس اقدام سعادت کے آثار شروع ہو گئے۔

ان تمام حالات پر غور کرو، کسی موقع پر بھی بنی اسماعیل نے ان کو غلام بنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جس طرح ایک شریف بھائی ہر موقع پر اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، اسی طرح انھوں نے ہر موقع پر ان کی مدد کی اور ان کے دشمنوں سے ان کی ذلتوں کا انتقام لیا۔ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے خود ان کے ہاتھوں بیچا تھا، لیکن انھوں نے ان کو غلام بنا کر رکھنا پسند نہیں کیا، بلکہ:

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ (یوسف - ۲۰)

اور انھوں نے یوسف کو معمولی قیمت، چند درہموں پر بیچ دیا اور وہ اس سے بے رغبت تھے۔

۷۔ ایک قابل لحاظ حقیقت یہ بھی ہے کہ بنی اسماعیل کو بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدا سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ شرارتوں اور بت پرستی کے واقعات کے علاوہ بارہا ایسا بھی ہوا کہ یہود۔ اللہ تعالیٰ کو یک قلم چھوڑ بیٹھے ہیں۔ تورات میں متعدد مقامات پر ان کے شرک کے ساتھ خدا سے ان کی بالکلیہ علیحدگی کا ذکر بھی آیا ہے (دیکھو یرمیاہ ب) لیکن عربوں نے کسی دور میں بھی اپنے حی وقیوم خدا کا دامن نہیں چھوڑا۔ البتہ انھوں نے اس کے دربار کے لیے بہت سے سفارشی ٹھہرا لیے تھے، جن کو نصاریٰ کی طرح خدا کے بیٹوں اور بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے۔ قرآن مجید میں ہے:

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ۔

ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا سے برتر سے قریب کریں۔

سورۂ یونس میں ہے:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ (یونس - ۱۸)

وہ خدا کے علاوہ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو ان کو کسی طرح کا نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے حضور ہمارے سفارشی ہیں۔

انھوں نے خدا سے بالکلیہ علیحدگی کبھی نہیں اختیار کی، وہ بیت اللہ کا حج کرتے تھے ان کے نام کی تکبیر کہتے تھے، اس کی عبادت و پرستش کرتے تھے۔ یہ ساری باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہود کا کفر عربوں کے کفر سے زیادہ سخت تھا۔

۸۔ یہود کے مقابل میں بنی اسماعیل کا عذر بھی زیادہ واضح ہے۔ وہ اپنے دین سے اس وقت ہٹے۔ جب امتدادِ زمانہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات بالکل فراموش ہو گئیں اور کوئی دوسرا نبی تذکیر و یاد دہانی کے لیے مبعوث نہیں ہوا بلکہ اس کے باوجود ان میں ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد باقی رہی جو دین حنیفی پر قائم رہے اور جو بت پرستی سے متنفر تھے۔ برعکس اس کے یہود نے عین اس نبی کے سامنے گوسالہ پرستی کی جس پر ایمان لائے تھے اور جس کے حیرت انگیز معجزات کا قدم قدم پر مشاہدہ کر رہے تھے، پھر نبی کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد بار بار بت پرستی کی لعنتوں میں گرفتار ہوئے۔ تورات کی کتاب القضاۃ اور سلاطین میں یہ تفصیلات مذکور ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ انذار اور اتمام حجت کے بغیر وہ کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتا۔ اس وجہ سے اس نے عربوں کو اپنے غضب سے محفوظ بھی رکھا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (اسراء ۱۵)

ہم اس وقت تک کسی قوم کو سزا نہیں دیتے جب تک اس کے پاس ایک رسول نہ بھیج لیں۔

بظاہر یہی وجوہ و اسباب ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس مقدس گھر کی ہمیشہ حفاظت کی۔ وللہ الحمد۔

۵- چند اشارات

بنی اسرائیل اور مسجد یروشلم کے مقابل میں، بنی اسمٰعیل اور خانہ کعبہ کے جو خصوصیات و فضائل اوپر بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم اشارات ہیں، جن میں سے چند ہم بعض شبہات کے ازالہ کے لیے یہاں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ بندے کے لیے یہ بات کبھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا سے مدعیانہ مطالبہ حقوق کرے اور یہ سمجھے کہ چونکہ اس میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں، اس وجہ سے وہ فلاں فلاں انعامات کا مستحق ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور اس کے تمام کمالات اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہیں۔ اس وجہ سے اس کا منصب صرف تذلل اور نیازمندی ہے۔ جو چیزیں بظاہر ایک طرح کی فضیلت نظر آتی ہیں وہ بھی خدا کی طرف سے رحمت کا ایک بہانہ ہیں۔ ایک شخص اگر دعا کرتا ہے تو اس کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس نے خدا پر کوئی احسان کر دیا، یا کوئی ایسا کارنامہ انجام دے دیا جس کے بعد وہ خواہ مخواہ خدا کی طرف سے اجر کا مستحق ہو گیا ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ صرف یہ خیال کرنا چاہیے کہ جس رحمٰن و رحیم کی عنایات سے بندہ بن مانگے ہر آن بہرہ مند ہو رہا ہے، وہ مانگنے والے اور گڑگڑانے والے کو اپنے در سے کبھی محروم نہیں لوٹائے گا۔ قرآن مجید اور تورات و انجیل

میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے۔ خدا برے اور بھلے دونوں کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کرے گا۔ اس امتیاز کے لیے اس نے آزمائش اور امتحان کا قانون رکھا ہے اسی قانون کے بموجب اس نے حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ انھوں نے اپنے عزیز لخت جگر کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا اور باپ بیٹے دونوں بندگی کے امتحان میں پورے اترے۔ بظاہر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے! لیکن غور کرو کیا انھوں نے خدا کے حضور میں جو چیز پیش کی، ان کی تھی؟ وہ بھی تو خدا ہی کی بخشی ہوئی تھی۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تاہم یہی بات خدا کے دریائے رحمت کے جوش میں آنے کا بہانہ بن گئی اور حضرت ابراہیمؑ کے لیے بے پایاں انعامات الٰہی کے دروازے کھل گئے۔

یہ حقیقت بالکل کھلی ہوئی ہے۔ لیکن جب دل سخت اور سیہ کاریوں کے سبب سے بے نور ہو جاتا ہے تو یہ کھلی ہوئی حقیقت بھی نظر نہیں آتی۔ اسی لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا:

اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہیم ہمارا باپ ہے کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا ان پتھروں سے ابراہیم کے لیے اولاد پیدا کر سکتا ہے۔" (متی باب ۳)

یہود اس خیال میں گویا قدریہ کے پیشرو ہیں۔ اس کے برعکس نصاریٰ نے دوسری طرف غلو کیا اور اعمال کو یک قلم لاحاصل قرار دے دیا جس کی دوسری مثال جہمیہ ہیں۔

اس تفصیل سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ فصل میں نبی اسمٰعیل کے جو فضائل بیان ہوئے ہیں وہ سب توفیق الٰہی کے ثمرات ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو حق تھا کہ وہ اپنے احسانات یاد دلا کر انھیں اپنی طرف لوٹنے اور صرف اپنی ہی بندگی و اطاعت کی دعوت دے۔

۲۔ جس طرح کسی بندے کو کبھی استحقاق کا گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ خدا کے کرم اور اس کے وعدوں پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اسی طرح کسی مسجد یا معبد کے متعلق جس کی تعمیر خدا کے نام پر ہوئی ہو، یہ خیال نہیں کر لینا چاہیے کہ اب اس کی حفاظت خدا پر فرض ہو گئی۔ زیادہ سے زیادہ صرف یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے اس وجہ سے جو چیز اس کے حضور میں قربت کا ذریعہ ٹھہرائی گئی ہے وہ اس کی نگرانی و حفاظت سے محروم نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر بیت اللہ کے وقت اور حضرت سلیمانؑ نے تعمیر بیت المقدس کے وقت نہایت گریہ و زاری کے ساتھ خدا سے ان کی مقبولیت کی دعا مانگی، کہ عبادت و بندگی اور تقرب و نیازمندی کے یہ مرکز اس کی حفاظت و نگرانی سے محروم نہ رہیں۔ لیکن یہ اسی وقت تک ہے جب تک یہ تقرب و بندگی کے مرکز رہیں، اگر یہ حقیقت فراموش ہو جائے اور لوگ اللہ کے عہد کو بھلا کر اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیں، تو وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ جو چیز ہدیہ نیاز بن کر ان کے اگلوں کے لیے تقرب الٰہی کا ذریعہ ہوئی، وہی چیز لعنت کا پتھر بن کر پچھلوں کی تمام عظمت کو پارہ پارہ کر دے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایسا فوراً ہی ہو جائے۔ خدا رحمت میں جلدی کرتا ہے، لیکن عذاب میں جلدی نہیں کرتا۔ تورات اور قرآن میں اس بات کو بار بار واضح کیا

گیا ہے اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن جن آنکھوں پر باطل آرزوؤں کی پٹیاں بندھی ہوئی ہوتی ہیں ان کو یہ حقیقت نظر نہیں آتی۔ ایسے لوگ اس خبط میں مبتلا رہتے ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے ہر قسم کے استحقاق کی ایک دائمی سند حاصل کر رکھی ہے۔

فصل دوم کے آخر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر غور کرو، اس سے اس مسئلہ پر روشنی پڑے گی۔ سورۂ توبہ کی اس آیت میں بھی یہی اشارہ ہے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ (توبہ - ۱۹)	کیا تم نے، ان لوگوں کو جو حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور مسجد حرام کا انتظام کرتے ہیں ان کے ہم رتبہ سمجھ لیا جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے حضور میں وہ برابر نہ ہوں گے۔

پس اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ اطاعت اور تقویٰ ہے۔ دین کے تمام شعائر اسی مقصد کے حصول کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ بندہ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا شکرگزار اور اس کی رحمتوں کا امیدوار ہے۔ یہ وسوسہ دل میں گزرنے نہ دے کہ وہ کسی چیز کا حقدار ہے۔

۳۔ خداوند تعالیٰ جب کسی گھر کو عزت دیتا ہے اور اس کو اپنے نام کی نسبت سے مقدس کرتا ہے (اور یہ شرف صرف متقین کی بنائی ہوئی مسجدوں ہی کو حاصل ہے۔ انما یتقبل اللہ من المتقین) تو وہ گھر اس کی برکتوں کا سرچشمہ اور اس کے عہد و میثاق کو تازہ کرنے کے لیے گویا اس کا دایاں ہاتھ بن جاتا ہے چنانچہ جب تک لوگ خلوص قلب اور تجدید عہد کے ارادہ کے ساتھ اس گھر کی چوکھٹ پر حاضر ہوتے رہتے ہیں وہ عہد قائم رہتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل سے فرمایا گیا تھا۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (البقرہ - ۴۰)	تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا۔

اور بنی اسماعیل سے فرمایا گیا:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ - ۱۵۲)	تم مجھ کو یاد رکھو میں تمھیں یاد رکھوں گا۔

لیکن جب وہ اس عہد کو توڑ دیتے ہیں اور اس طرح گویا خود اس گھر کو ڈھانے کے لیے تیشے لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو خداوند تعالیٰ جو تمام عالم سے بے نیاز ہے، ان کو چھوڑ دیتا ہے اور وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

اس کا یہ فیصلہ قوم کی اکثریت کی حالت پر مبنی ہوتا ہے۔ یا تو قوم کا بڑا حصہ نافرمان اور عہد شکن ہو جاتا ہے، اس وجہ سے وہ بربادی کے حوالہ کر دی جاتی ہے یا نافرمان تو تھوڑے ہوتے ہیں، لیکن اکثریت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے غافل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں بھی قوم تباہ ہو جاتی ہے کیونکہ تقویٰ کا نصف حصہ خیر میں تعاون اور شر سے روکنا ہے۔ اگر کوئی قوم شر کے روکنے کے فرض سے غافل ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے اندر تباہی کو گھسنے کی راہ دے دی۔ سورہ والعصر میں ہم اس کو مفصل بیان کر چکے ہیں۔

یہ جو ہم نے کہا ہے یہ عدل الٰہی کا ایک عام اور کھلا ہوا قانون ہے۔ لیکن کبھی کبھی خداوند تعالیٰ کی حکمت مقتضی ہوتی ہے

کہ کسی قوم کی نادانیوں سے درگزر کرے یا کسی خاص بہتری یا کسی خاص حکمت کی وجہ سے، جس کو صرف وہ حکیم اور علام الغیوب ہی جانتا ہے، شریروں کا ہاتھ فوراً نہ پکڑے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ نے تورات انجیل کو بالکل بدل ڈالا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مدت تک مہلت دی برخلاف قرآن مجید کے کہ شریروں اور کج اندیشوں نے بہتیرا چاہا کہ اس میں دست اندازی کریں لیکن اس کا ایک نقطہ بھی اس کی جگہ سے ہٹانے کی ان کو مہلت نہ مل سکی۔

۶۔ اصحابِ فیل کا واقعہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق

اُصحاب فیلؔ کا واقعہ، اجمالاً اور تفصیلاً، دونوں طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اجمالاً تو خود قرآن مجید نے بیان کر دیا ہے۔ اور اس کی تفصیلی شکل وہ ہے، جو مختلف قسم کی صحیح و ضعیف روایات سے اخذ کر کے تفسیروں میں پیش کی گئی ہے۔ مفسرین عموماً قصہ کی تمام تفصیلات، روایات سے اخذ کر کے بیان کرتے ہیں اور ضعیف و قوی روایات میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ شکل مضر اور عموماً صحیح تاویل تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ واقعہ کی اصل شکل روایات سے بالکل الگ کر کے دیکھی جائے۔ اس کے بعد روایات پر نظر ڈالی جائے اور کمزور روایات کو صحیح روایات سے چھانٹ کر الگ کیا جائے۔

پہلے قرآن مجید پر غور کرنا چاہیے۔

قرآن مجید نے اس واقعہ کو نہایت مجمل طریقہ سے بیان کیا ہے۔ اس سے نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ کعبے کے ڈھانے کے لیے آئے تھے۔ یا کسی اور مقصد سے آئے تھے؟

اس اجمال کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ نہایت مشہور تھا، حتیٰ کہ عربوں نے اسی واقعہ سے اپنی تاریخ کا آغاز کیا اور ان کے اشعار میں بکثرت اس کا تذکرہ ہوا (دیکھو فصل ۱۰) اور چونکہ اجمالی بیان کسی واقعہ کی شہرت کی دلیل ہے اس وجہ سے بلاغت قرآن نے اسی پہلو کو ترجیح دی۔ چنانچہ کلام کا آغاز "اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ" سے ہوا ہے۔ یہ طریق خطاب اسی وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب جماعت کا ہر فرد واقعہ سے اس طرح واقف ہو گویا اس نے اس کا عینی مشاہدہ کیا ہے۔ کسی امر کا اقرار کرانے کے لیے بھی عربی زبان میں یہی اسلوب ہے۔ جب یہ انداز کلام اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کسی مشہور و معروف ہی بات کا ذکر آتا ہے۔ ایسے مواقع پر تفصیل مناسب نہیں ہوا کرتی۔ مثلاً سورۂ فجر میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ٥ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ٥ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی الْبِلَادِ ٥ وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ٥ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ ٥ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ ٥ فَاَکْثَرُوْا فِیْھَا الْفَسَادَ ٥ فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ (الفجر ۶-۱۳)	کیوں دیکھا نہ تیرے خداوند نے عاد کے ساتھ کیا کیا، ستونوں والے ارم کے ساتھ جس کا نظیر کسی ملک میں نہیں تھا اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں پتھر کاٹے اور میخوں والے فرعون کے ساتھ یہ سب جنھوں نے ملک میں سر اٹھائے اور بڑی بڑی خرابیاں ڈالیں، سو تیرے خداوند نے ان پر عذاب کے تازیانے برسائے۔

دیکھو، ان قوموں کی جو خصوصیتیں نہایت مشہور تھیں۔ انہی کی طرف اجمالی اشارے کر دیے ہیں۔

اسی طرح اصحاب فیل کے قصے میں بھی، اجمال و اشارہ ہی مناسب تھا۔ تمام واقعہ میں سے اتنا حصہ بیان کر دیا جتنا اس سورہ یا بعد والی سورہ کے موقع اور نظم کا تقاضا تھا۔ گویا قصہ کا اجمالی خلاصہ یہ ہوا کہ اصحاب فیل کو، جنھوں نے بیت اللہ کی تخریب کی سازش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ اس کی بے شمار فوجوں میں سے ایک فوج نمودار ہوئی اور اس نے پتھراؤ کر کے ان کو پارہ پارہ کر دیا، تاکہ ان کو اس گستاخی کی سزا دے جو انھوں نے اللہ کے محترم گھر کے ساتھ کی اور عربوں خصوصاً قریش پر احسان فرمائے۔

واقعہ کا اتنا حصہ قطعی طور پر ثابت ہے۔ اس میں روایات کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ روایات پر الگ غور و بحث کرنا چاہیے تاکہ صحیح واقعہ منقح ہو سکے۔

اب ہم روایات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ تین عنوانوں سے ان پر غور کریں گے۔

۱۔ وہ روایات جو ابرہہ کے حملہ اور ان واقعات و حالات سے متعلق ہیں جو ابرہہ اور عربوں کے درمیان پیش آئے۔

۲۔ وہ روایات جو اصحاب فیل کی سنگباری سے متعلق ہیں۔

۳۔ وہ روایات جو واقعہ طیر سے متعلق ہیں۔

۷۔ ابرہہ کے حملہ کا سبب، اہلِ مکہ کا فرار، عبدالمطلب سے گفتگو

ابرہہ کے حملہ کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عربوں سے ناراض ہو گیا تھا اس وجہ سے اس نے مکہ پر حملہ کر دیا۔ لیکن حملہ کے اس سبب اور اہل مکہ کے فرار اور ابرہہ و عبدالمطلب کی گفتگو سے متعلق، جو حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں، سب یکقلم بے بنیاد ہیں۔ از روئے سند، ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق پر ختم ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔ نیز دوسری روایات سے ان کی تردید ہوتی ہے اور عربوں کا مشہور کیریکٹر بھی ان باتوں سے ابا کرتا ہے۔

خود واقعات کی نوعیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام باتیں دشمنوں کی گڑھی ہوئی ہیں۔ ان میں عربی غیرت و حمیت کی علانیہ تحقیر اور قریش کے غیور سردار عبدالمطلب کی بیبا کانہ توہین کا پہلو بالکل نمایاں ہے۔ نیز ابرہہ کے کیریکٹر کو بہت شاندار دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ایک شخص پر ایک کنیسہ کی توہین کا الزام تراش کر بیت اللہ الحرام پر اس کے حملہ کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس پوری داستان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذلت و ندامت اور بے غیرتی و پست ہمتی کا کوئی ایسا الزام نہیں ہے جو عربوں پر عموماً اور قریش اور ان کے سردار پر خصوصاً نہ تھوپا گیا ہو۔ ان خرافات کی تردید پر زیادہ وقت ضائع کرنے کا موقع نہیں ہے تاہم مختصراً ان وجوہ کو دکھانا ہے، جن سے ان روایات کی اصل حقیقت واضح ہو سکے۔

۱۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا تو قریش کے سردار عبدالمطلب بجائے اس کے کہ قوم کو ساتھ لے کر اس گھر کی حفاظت کے لیے اٹھتے قوم کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ انھوں نے کہا کہ اس گھر کا رب خود اس کی حفاظت کر لے گا، اس کے بعد خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک دعا مانگی اور تمام اہل مکہ کے ساتھ پہاڑیوں میں چلے گئے۔

لیکن دنیا کے پردے میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر نہ سمجھتی ہو، پھر اس سے اس بے حمیتی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بغیر کسی مدافعت کے، اپنا معبد دشمنوں کے حوالہ کرکے پہاڑوں میں جا چھپے گی۔ اس طرح کی بے حمیتی کا گمان تو ہم دنیا کی ادنیٰ قوموں کی نسبت بھی نہیں کرسکتے، تو قریش اور بنی اسماعیل کی نسبت کس طرح کرسکتے ہیں جن کا تمام تر سرمایۂ فخر و نازش ہمیشہ شہسواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی ہی رہا ہے۔ یہاں تک کہ غیروں کو بھی اعتراف ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر آنچ آنے نہیں دی۔

۲۔ روایتوں میں یہ بھی ہے کہ عبد المطلب کے کچھ اونٹ ابرہہ کے آدمی ہنکا لے گئے تھے۔ عبد المطلب ان کے مانگنے کے لیے ابرہہ کے پاس گئے۔ ابرہہ نے ان کی نہایت عزت کی۔ یہاں تک کہ تخت شاہی سے اتر کر فرش پر بیٹھ گیا اور ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا، پھر گفتگو شروع ہوئی اس نے کہا۔ آپ اپنے سو اونٹوں کے لیے مجھ سے ملنے آئے ہیں، حالانکہ میں کعبے کو ڈھانے آیا ہوں، جو آپ کا اور آپ کے آبا و اجداد کا دینی مرکز ہے، لیکن آپ اس کی نسبت مجھ سے ایک حرف نہیں کہتے۔

غور کرو، عبد المطلب کے ساتھ جس اخلاق سے وہ پیش آیا اور جس طرح ان سے اس نے باتیں کیں اس سے پوری امید بندھتی ہے کہ اگر وہ اس سے خانہ کعبہ کے بارہ میں کوئی خواہش کرتے تو وہ اس کو آسانی سے رد نہ کرتا۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ چند اونٹوں کے لیے تو اس سے درخواست کرتے اور اصل معاملہ کو بالکل ٹال جاتے؟ پھر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ان کی قرشی حمیت نے چند اونٹوں کے لیے، ابرہہ کی خوشامد کا ننگ گوارا کیونکر کیا۔

۳۔ اہل سیر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ابرہہ کے حملہ کے پہلے دن سے، قبائل عرب، وقتاً فوقتاً اس کی فوج پر تاخت کرتے رہتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب عموماً نہ صرف اس کے مخالف تھے بلکہ اس سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ ابرہہ کے ساتھ ان کی جو جھڑپیں ہو رہی تھیں ان کا چرچا بھی ہر جگہ پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ بعض شعراء نے اس پر فخریے بھی لکھے ہیں۔ قدیم اسلامی شاعر ذوالرمہ کہتا ہے۔

وأبرهة اصطادت صدور رماحنا ... جهاراً وعثنون العجاجة أكدر

اور ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا

تنحّى له عمرو فشكّ ضلوعه ... بنافذة نجلاء والخيل تصبر

عمرو نے اس کی طرف لپک کر، نیزے کے کاری زخم سے اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم رہے

ان شعروں میں صاف تصریح ہے کہ ذوالرمہ کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس دن پیش آیا ہے، کثیف غبار آسمان تک بلند تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ہوا کا طوفان بھیج کر ان پر سنگریزوں کی بارش کی۔ تفصیل اس کی دسویں فصل میں آئے گی۔

الغرض اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ عربوں نے اپنے مقدس شہر کی حفاظت کی۔ یہی بات ہر پہلو سے قرین عقل معلوم ہوتی ہے۔ تمام عرب دل سے کعبہ کی عزت کرتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش اس قدر مرعوب ہوجائیں کہ اس چیز کی

حمایت کے لیے بھی ان کے خون میں کوئی حرارت نہ پیدا ہو جس پر ان کی تمام عظمت و سیادت کی بنیاد تھی۔ دین و مذہب کا سوال چھوڑ دو، وہ اپنے آبائی شرف کی تمام کائنات جیتے جی کیسے برباد ہوتے دیکھ سکتے تھے۔

۴۔ علمائے سیر کے بیان کے مطابق، ابرہہ کا حملہ، موسم حج میں ہوا تھا۔ بعض شعراء کے اشعار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ابرہہ کے آدمی قربانی کے کچھ اونٹ بھی ہنکا لے گئے۔ عکرمہ بن ہاشم بن عبد مناف نے اپنے اشعار میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے:

لاهمّ أخز الأسود بن مقصود ... الآخذ الهجمة فيها التقليد

خداوندا! اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جن کی گردنوں میں قلادے تھے، ہنکا لے گیا

بين حراء وثبير فالبيد ... يحبسها وهي أولات التطريد

حراء، ثبیر اور بید کے درمیان ان کو روکا اور وہ ہنکائے جانے کے لیے تھے۔

فضمّها إلى طماطم سود ... أخفره يا رب وأنت محمود

پھر ان کو حبشی غلاموں کے حوالہ کیا، خداوندا! تو اس کو اپنی امان سے محروم کردے، تو سزاوار حمد ہے۔

اس وجہ سے اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ قریش ہمت ہار گئے تھے، تو کیا سارا عرب ہمت ہار بیٹھا تھا؟ اور پڑھ چکے ہو کہ ان کا اِکا دکا قبائل، وقتاً فوقتاً، ابرہہ کی فوج پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب حج کے موقع پر ایک مرکز سے پوری اجتماعی طاقت کے ساتھ عین کعبہ کے سامنے، ان کو دشمن سے مقابلہ کرنے کا موقع ملے تو وہ کمزوری دکھائیں اور مقابلہ کرنے کے لیے پہاڑوں میں جا چھپیں؟ ایسی فضول بات کون باور کرسکتا ہے؟

۵۔ عرب شعراء نے اپنے اشعار میں قبیلۂ ثقیف کی ہجو کی ہے کہ خانہ کعبہ کی حمایت کے وقت اس نے بزدلی دکھائی اور دشمن سے سازباز کرلیا۔ چنانچہ ضرار بن خطاب کا شعر ہے۔

وفرّت ثقيف إلى لاتها ... بمنقلب الخائب الخاسر

اور ثقیف ایک نامراد بھاگنے والے کی طرح اپنے معبود لات کی طرف بھاگ گئے۔

ابرہہ کے ساتھ قبیلۂ ثقیف کی سازباز پر تمام روایات متفق ہیں اور ابو رغال ثقفی کی قبر اس گناہ پر کہ اس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا، سنگسار کی گئی۔ پھر سوچنے کی بات ہے کہ اگر ثقیف کی طرح تمام عرب بھاگ گئے تھے تو آخر قبیلۂ ثقیف ہی کا کیا قصور تھا کہ ان کی ہجو کی گئی پھر تو ان کا غدر بھی بالکل واضح تھا۔

۶۔ کہا جاتا ہے کہ ابرہہ نہایت بردبار آدمی تھا۔ وہ خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرتا، لیکن قبیلۂ فقیم کے ایک آدمی نے ایک گرجے میں گھس کر توہین کے ارادہ سے اس کو نجس کردیا، جس سے اس کو اشتعال ہوا، اور اس نے خانہ کعبہ پر فوج کشی کر دی۔ لیکن ابرہہ کی پوری سوانح عمری اس حسن ظن کی تردید کرتی ہے۔ وہ ایک نہایت متعصب شخص تھا۔ اس نے جب یمن پر قبضہ کیا ہے تو وہاں کے یہودی امیر اریاط کو قتل کردیا اور یمن سے یہودیت کا بیخ و بن سے خاتمہ کر ڈالا۔ پھر ایک شاندار گرجا بنوایا اور نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لیے ایک ایسا گرجا تعمیر کرایا ہے جس کی نظیر چشم فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔ میں

نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عربوں کے حج کا رخ بھی اسی طرف پھیر دوں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو ابرہہ کا خانہ کعبہ کے ڈھانے کا منصوبہ تیار کرنا بالکل قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ خانہ کعبہ کی محبت عربوں کے خون میں گھلی ہوئی تھی وہ اس کو اپنے باپ ابراہیمؑ کی تعمیر اور اپنا دینی و دنیاوی مرکز سمجھتے تھے۔ ان کو اس سے ہٹانے کی ایک ہی تدبیر ممکن تھی کہ اس کو یک قلم ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا جائے۔

واقعات کا یہ سلسلہ بالکل فطری معلوم ہوتا ہے۔ رہا کنیسہ کو نجس کر دینے کا واقعہ تو یہ بالکل گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یا تو اس لیے گڑھا گیا ہوگا کہ ابرہہ کی برہمی کا کوئی سبب پیدا کیا جائے یا بوجہ حسن ظن اس کی اس مجنونانہ حرکت کے لیے ایک عذر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ درمنثور میں اسی قسم کی ایک اور روایت بھی ہے، جس میں حملہ کا ایک دوسرا سبب بتایا گیا ہے لیکن مقصود ایک ہی ہے۔

"عثمان بن مغیرہ بن اخنس سے روایت ہے کہ اصحاب فیل کا قصہ یوں ہے کہ ابرہہ اخرم حبشی یمن کا بادشاہ تھا۔ اس کا نواسا اکسوم بن صباح حمیری حج کے لیے گیا۔ مکہ سے واپسی پر وہ نجران کے ایک گرجے میں اترا۔ اہل مکہ کی ایک جماعت نے گرجے پر ڈاکہ ڈالا اور گرجے کے سامانوں کے ساتھ اکسوم کا تمام سامان بھی لوٹ لیا۔ اکسوم نے اپنے نانا سے فریاد کی۔ اس نے اپنے درباریوں میں سے ایک شخص شہر بن معقود کی قیادت میں بیس ہزار آدمی روانہ کیے۔"

اصحاب فیل کے حملہ سے متعلق صاحب درمنثور نے اسی روایت پر اعتماد کیا ہے لیکن اس کی لغویت بالکل واضح ہے۔ جب ایسی روایات موجود ہیں جو ابرہہ کے حالات اور واقعات کی طبعی رفتار سے پوری مطابقت رکھتی ہیں تو اس قسم کی روایات کی مدد لینے کی کیا ضرورت ہے؟

۷۔ قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب فیل نے ایک مخفی چال (کید) چلی تھی، لیکن روایات میں اس کے حملے کے جو وجوہ بیان کیے ہیں، ان میں مخفی چال کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ اس کے برعکس قوت کی نمائش اور عربوں کی تذلیل کی ایک نہایت کھلی ہوئی کارروائی ہے۔ البتہ قابلِ اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی چال) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اس نے احترام کے مہینوں میں حملہ کیا، کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ و خونریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔

۳۔ اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں قربانی میں مصروف ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آ رہے ہوں گے۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب یہ دیکھو کہ خداوند تعالیٰ نے ان کی چالوں کو کس طرح ناکام بنا دیا۔

۱۔ ان کی فوج کو بطن محسر ہی میں روک دیا۔

۲۔ محسر کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا۔

۳۔ خدا نے خانہ کعبہ کے ان دشمنوں پر آسمان سے سنگریزے برسانے والی آندھی بھیجی۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اہل مکہ نے پوری قوت سے اصحاب فیل کا مقابلہ کیا اور ان پر پتھراؤ کیا۔ باقی رہی ابرہہ کی بردباری اور شرافت کی داستان تو یہ عقل و نقل کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بھی خلاف ہے۔

۸۔ اصحاب فیل پر سنگباری

اصحاب فیل پر سنگباری کا واقعہ کعبہ کی عظمت اور آنحضرت صلعم کی بعثت کی ایک عظیم الشان نشانی ہے۔ چنانچہ جیسا کہ بعض پیشین گوئیوں میں اشارہ تھا، آنحضرت صلعم اسی سال پیدا ہوئے لیکن اس نشانی کی عظمت اس کے عجیب و غریب اور خارق عادت ہونے میں نہیں ہے۔ نشانیوں اور معجزوں کے ظہور کے لیے جو عام قانون الٰہی ہے یہ نشانی بھی بالکل اسی قانون کے اندر ہے۔ قدرت کے تمام کارخانۂ خلق و ایجاد میں پردہ داری کی جو شان ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کارفرمائے غیب کی وہ شانِ حجاب معجزات کے ظہور میں بھی بدستور قائم رہتی ہے۔ اس کی حکمت نے عالم غیب اور عالم شہود کے مابین اسباب کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ اور اس کی مرضی یہ ہے کہ ہم اس کے جمال و جلال کا مشاہدہ ان پردوں کی آڑ ہی سے کریں، تاکہ امتحان و آزمائش اور آزادی کے ساتھ تربیت اخلاق کا جو مقصد قدرت نے پیش نظر رکھا ہے۔ وہ پورا ہو۔ کافر ان حجابات میں کھو جایا کرتا ہے لیکن مومن کی نگاہ ان حجابات سے گزر کر شاہد حقیقی کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔

ان عجائب و معجزات کا قدرت کے عام ضابطہ کے مطابق ہونا خدا کے اس امر و حکم کے سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے، جو تمام کارخانۂ خلق کی روح ہے۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (النمل ۸۸) اس خدا کی نادرہ کاری جس نے ہر چیز کو مکمل بنایا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں معجزات کے لیے کوئی مخصوص لفظ نہیں آیا ہے۔ عام مظاہر فطرت کے لیے آیات (نشانیاں) کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، بعینہٖ وہی لفظ قرآن نے معجزات کے لیے بھی استعمال کیا ہے صرف عام لوگوں کی سمجھ کی رعایت سے کہیں کہیں آیات کے ساتھ "بَیِّنٰت" (واضح کھلی ہوئی) کا لفظ لگا دیا ہے۔ رہے اہلِ نظر تو ان کے لیے تمام عالم "بینات" ہی ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہماری کتاب عیون العقائدؒ میں ملے گی۔

ہمارا اصلی عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ تمام کائنات ہر وقت خدا کے دست تصرف میں ہے۔ اس کے ملائکہ اس کے احکام کی تنفیذ کرتے ہیں اور یہ تمام کارخانہ اس کے حکم کے مطابق ایک خاص نظام حکمت کے تحت چل رہا ہے۔ اس یقین کے بعد انسان خدا کی نشانیوں پر غور کرنے کا اہل بن جاتا ہے، اور اس کی خشیت و حکمت میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب واقعہ فیل پر غور کرو۔

قرآن مجید اور یہود کے صحیفوں میں ایک سے زیادہ مواقع پر آنحضرت صلعم اور حضرت موسیٰ کے درمیان مماثلت واضح کی گئی

ؒ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب بھی ابھی مسودہ کی صورت میں پڑی ہوئی ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کا معتدبہ حصہ انھوں نے لکھ ڈالا تھا۔ اس وجہ سے مناسب حالات کے پیدا ہوتے ہی ان شاء اللہ اس کی اشاعت کی کوشش کی جائے گی (مترجم)

ہے۔ ہم واقعہ فیل پر غور کرتے ہوئے بھی اس مماثلت کے بعض پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ اس معجزہ کی سب سے پہلی مثال غزوۂ بدر میں ملتی ہے۔ آنحضرت صلعم نے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور قریش کی طرف رخ کر کے فرمایا "شاھت الوجوہ" (خدایا یہ چہرے بگڑ جائیں) اس کے بعد کنکریاں ان کی طرف پھینکیں اور صحابہ سے فرمایا "بڑھو" اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام کفار کی آنکھوں کی پڑ گئی۔ اسی کی نسبت سورۂ انفال میں فرمایا ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال) — جب تم نے کنکریاں ماریں تو تم نے نہیں ماریں بلکہ اللہ نے ماریں۔

دیکھو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی رمی کو اپنی رمی کے لیے ایک پردہ بنایا۔ گو اس موقع پر دو طرف سے کنکریاں پھینکی گئیں، ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو کفار نے دیکھا اور ایک خدا کی طرف سے جس کو وہ دیکھ تو نہ سکے لیکن اس کے اثر کو انھوں نے محسوس کیا۔ اسی وجہ سے آیت میں نفی و اثبات دونوں ساتھ ساتھ آئے ہیں۔

بعینہٖ یہی صورت واقعۂ فیل میں بھی نظر آتی ہے۔ قریش سنگ باری کر کے ابرہہ کی فوج کو، خانہ کعبہ سے دفع کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی پردہ میں، ان پر آسمان سے سنگباری کر دی۔ چنانچہ جس طرح غزوۂ بدر کی سنگباری کو اس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ) اسی طرح یہاں کفار کو کھانے کے بھس کی طرح بنا دینا بھی اپنی قوت قاہرہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ کیونکہ قریش کے لیے ابرہہ کے لشکر گراں کو پارہ پارہ کر دینا تو درکنار اس کو پیچھے ہٹا دینا بھی آسان نہ تھا۔

۲۔ یہ معجزہؔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات میں سے چھٹے معجزہ سے مشابہ ہے، کتاب خروج ب ۹: ۸-۱۱ میں ہے۔

"اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ دونوں ہاتھ بھر کے بھٹی کی راکھ سے لو اور موسیٰ اسے آسمان کی طرف اڑائے اور وہ مصر کی ساری زمین میں غبار ہو جائے گی، اور تمام ملک مصر میں آدمی اور چارپایوں کے بدن پر پھوڑے اور پھپھولے ہوں گے چنانچہ انھوں نے بھٹی کی راکھ لی اور فرعون کے آگے کھڑے ہوئے اور موسیٰ نے اسے آسمان کی طرف پھینک دیا اور وہیں آدمی اور بہائم کے بدن پر پھوڑے اور پھپھولے پیدا ہو گئے اور جادوگر پھوڑوں کے سبب سے موسیٰ کے آگے کھڑے نہ رہ سکے، کہ جادوگروں اور سارے مصریوں پر پھوڑے تھے۔"

واقعہ فیل کے موقع پر جو سنگباری ہوئی بعینہٖ اسی قسم کا اثر اس کا اصحاب فیل پر بھی ہوا۔ حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ "جس کو پتھر لگے، اس کو چیچک نمودار ہو گئی"۔ حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؓ سے بھی اسی مطلب کی روایات ہیں۔ لیکن مصریوں کے پھپھولے مہلک نہ تھے اور اصحاب فیل کو جو چیچک نکلی اس نے اکثروں کا وہیں خاتمہ کر دیا اور جو بچ رہے وہ بھی بھاگتے ہوئے راستوں میں ختم ہو گئے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ "وہ واپسی میں راستوں اور گھاٹوں پر گرتے اور مرتے رہے"۔

۳۔ اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آٹھویں معجزہ سے بھی مشابہت ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ وہ کوہ پیکر ہاتھیوں اور

---

[1] مصنفؒ نے ان مواقع پر آیات کا لفظ استعمال کیا ہے، میں نے مجبوراً ترجمہ میں معجزہ کا لفظ اختیار کیا ہے لیکن اس سے ہمارے متکلمین کا اصطلاحی معجزہ نہیں سمجھنا چاہیے، فصل کے شروع میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پیش نظر رکھیے (مترجم)

مقتولوں کی لاشوں کو کھانے کے لیے خدا نے سمندر کی جانب سے چڑیوں کے جھنڈ بھیجے۔ اگر یہ لاشیں پڑی رہتیں تو ایک مدت تک کے لیے مکہ ناقابلِ سکونت ہو جاتا۔

اسی طرح کا ایک معجزہ حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں بھی ظاہر ہوا۔ سفر خروج (ب ۱۰: ۱۲-۱۹) میں حضرت موسیٰؑ کا معجزہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ ٹڈیوں کے لیے مصر کی زمین پر بڑھا، تاکہ وہ ملک مصر پر آئیں اور ہر ایک سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے کھا لیں، پس موسیٰ نے زمین پر اپنا عصا اٹھایا اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پروا آندھی چلائی، جب صبح ہوتی تو پروا آندھی ٹڈیاں لاتی اور ٹڈیاں تمام مصر پر آئیں اور مصر کے تمام اطراف پر بیٹھیں اور ایسی بے شمار تھیں کہ ان سے پیشتر ایسی ٹڈیاں نہ آئی تھیں، نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کہ سارا روئے زمین ان سے چھپ گیا، ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انھوں نے اس زمین کی ہر ایک سبزی اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے، چاٹ لیا اور تمام ملک مصر میں کسی درخت پر اور میدان کی گھاس میں سبزی نہ چھوڑی۔ تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو جلد بلایا اور کہا کہ میں خداوند تمھارے خدا کا اور تمھارا گنہگار ہوں، سو اب میں تمھاری منت کرتا ہوں فقط اس مرتبہ میرا گناہ بخشو، اور خداوند اپنے خدا سے شفاعت کرو، کہ فقط اسی موت کو مجھ سے دور کر دے، چنانچہ وہ فرعون پاس سے نکل گیا، اور خداوند سے شفاعت کی اور خداوند نے پچھوا آندھی بھیجی جو ٹڈیوں کو لے گئی اور دریائے قلزم میں ڈال دیا۔

ٹڈیوں کی طرح چڑیاں بھی سمندر ہی کی جانب سے آئی تھیں۔ ان کا آنا بھی ایک بے نظیر واقعہ کی حیثیت سے پیش آیا تھا۔ کثرت میں وہ بالکل ٹڈی دل کی طرح تھیں۔ جس طرح ٹڈیوں نے اولوں کی تباہ کی ہوئی سبزیوں اور میووں کو صاف کر دیا، اسی طرح ان چڑیوں نے بھی ابرہہ کے سنگسار کردہ لشکر کو جو بالکل بھس کی طرح ہو گیا تھا، صاف کیا۔

اگلی فصل میں ہم اس پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

۹- واقعۂ طیر

ہم نے کہا ہے کہ چڑیاں مکہ کو مقتولین کی لاشوں سے صاف کرنے کے لیے آئی تھیں، حالانکہ مشہور روایت ہے کہ وہ اصحاب فیل کو سنگسار کرنے کے لیے بھیجی گئی تھیں۔ ہمارا یہ دعویٰ چونکہ مشہور روایت کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ضرورت ہے کہ ہم روایات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں۔

روایات پر غور کرنے سے ہمارے سامنے دو فریق آتے ہیں اور دونوں فریق واقعہ کی تصویر دو مختلف طریقوں سے کھینچتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دینے سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں کے مختلف فیہ پہلوؤں کو الگ الگ دیکھ لیا جائے۔

ایک فریق کے بیانات یہ ہیں۔

۱۔ چڑیاں شکاری قسم کی اور بڑے قد کی تھیں۔

۲۔ ان کے رنگ اور صورتیں اس اس طرح کی تھیں۔

۳۔ انھوں نے اصحاب فیل کی لاشوں کو کھایا۔

۴۔ اصحاب فیل پر ہر سمت سے پتھر برسے۔

۵۔ پتھروں کے لگنے سے ان کو چیچک ہوگئی۔

۶۔ ان کی ہلاکت ایک ہی جگہ نہیں واقع ہوئی، بلکہ بھاگتے ہوئے بہت سے ان میں سے راستوں میں مرے۔

دوسرے فریق کے بیانات یہ ہیں۔

۱۔ چڑیاں اصحاب فیل کو پتھر مارتی تھیں۔

۲۔ پتھر ان کی چونچوں اور چنگلوں میں ہوتے تھے۔

۳۔ یہ پتھر سواروں کے جسموں سے گزر کر ہاتھیوں کے جسموں میں گھس گھس جاتے تھے۔

۴۔ جو جہاں تھے وہیں ڈھیر ہو کے رہ گئے۔

۵۔ ایک سیلاب آیا جو مقتولین کی لاشوں کو بہالے گیا۔

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھو۔

اب ہم دونوں قسم کی روایتیں تفسیر ابن جریر سے نقل کرتے ہیں۔ ہم نے صرف اسی ایک کتاب پر اکتفا کیا ہے اور قصداً ایسی کتابوں کو نظر انداز کر دیا ہے جن میں بغیر کسی جرح و تنقید کے ضعیف و موضوع روایات بھر دی گئی ہیں۔

۱۔ عکرمہؓ سے طَیْرًا اَبَابِیْلَ[1] کے بارہ میں روایت ہے کہ یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں، سمندر کی سمت سے آئی تھیں، ان کے سر شکاری چڑیوں کے سر کی طرح تھے۔

۲۔ محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے طیرا ابابیل کے بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد چڑیاں ہیں۔ ان کے چڑیوں کی طرح کے سونڈ اور کتے کے پنجوں کے مانند چنگل تھے۔

یہ دوسری روایت حضرت ابن عباس سے متعدد طریقوں سے مروی ہے۔ اس میں ایک بات قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے ان چڑیوں کی چونچوں کے لیے خرطوم (سونڈ) کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو شکاری چڑیوں کی چونچوں کے لیے مستعمل ہے، چنانچہ امراء القیس کا شعر ہے:

کانہا لقوۃ طلوب کان خرطومہا منشال

وہ اونٹنی جھپٹنے والے عقاب کی طرح ہے جس کی چونچ کرچھے کے مانند ہے

۳۔ سعید بن جبیر نے طیرا ابابیل کے بارہ میں فرمایا: یہ چڑیاں سیاہی مائل خاکی رنگ کی تھیں اور زرد گوں چونچوں سے ان کا گوشت کھاتی تھیں۔

دیکھو عکرمہ اور ابن عباس کی روایت سے صاف واضح ہے کہ چڑیاں بڑے قد کی شکاری چڑیوں کی قسم کی تھیں مثلاً گدھ وغیرہ۔ ابن جبیر والی روایت میں تصریح ہے کہ وہ ان کی لاشوں کو کھاتی تھیں۔ ان روایات میں چڑیوں کے پتھر مارنے کا

[1] مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے تمام روایتیں بقید سند نقل کی ہیں۔ میں نے بقصد اختصار سند حذف کر دی ہے (مترجم)

کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس کے بعد ہم کو دو روایتیں ملتی ہیں جو قتادہ اور عبید بن عمیر سے مروی ہیں۔ جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ چڑیاں چونچوں اور چنگلوں میں پتھر لیے ہوئے نمودار ہوئی تھیں۔ ان روایات میں ان چڑیوں کے شکاری ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ان کے علاوہ ایسی روایتیں بھی ہیں، جن میں یہ دونوں قسم کی باتیں گڈمڈ ہوگئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راویوں کی بد اعتقادی ہے۔ انھوں نے غلطی سے دونوں قسم کی روایتوں میں خلط مبحث کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں مختلف روایتیں باہم گڈمڈ ہوگئی ہیں۔

اب ان دونوں قسم کی روایات پر غور کرنا چاہیے۔

جن لوگوں نے چڑیوں کی شکل و صورت، ان کا رنگ، ان کی چونچوں کی زرد گونی، ان کا لاشوں پر گرنا، سب کچھ بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا بیان عینی شہادت پر مبنی ہوگا۔ باقی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چڑیاں چونچوں اور چنگلوں میں پتھر اٹھائے ہوئے تھیں تو یا تو انھوں نے اوپر سے پتھر برستے ہوئے دیکھے اور دور سے یہ گمان کر لیا کہ یہ چڑیاں پھینک رہی ہیں یا تَرْمِیْهِمْ کی ضمیر کا مرجع انھوں نے طیراً کو سمجھا اور پھر اصل واقعہ کی تحقیق کیے بغیر آیت کی جو تاویل ان کے ذہن میں آئی اسی سانچہ میں انھوں نے قصہ کو بھی ڈھال لیا۔ اس کے بعد جب یہ سوال سامنے آیا کہ ہاتھیوں اور مقتولین کی متعفن لاشیں جن سے تمام وادی مکہ اٹ گئی تھی، کس طرح دور کی گئیں تو اس کا جواب یہ دے دیا کہ اللہ تعالے نے سیلاب بھیجا اور وہ سب بہالے گیا۔ حالانکہ اس جواب کے بعد یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جو بے پناہ سیلاب ان تمام ہاتھیوں اور اتنی بے شمار لاشوں کو بہالے گیا آخر اس کی زد سے وادی مکہ کے باشندے کیسے بچ گئے؟ بہرحال یہ ایک رائے اور قیاس ہے، اس کو مشاہدہ اور ذاتی واقفیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آگے بڑھ کر ان لوگوں کو ایک اور اشکال بھی پیش آیا ہے، وہ یہ کہ ان چڑیوں کے چنگلوں اور چونچوں سے جو پتھر گرتے رہے ہوں گے، ظاہر ہے وہ سیدھے گرتے رہے ہوں گے، پھر ان ہاتھیوں کو کیسے لگے ہوں گے جو ہودجوں اور سواروں سے بالکل ڈھکے ہوئے تھے؟ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا ہے کہ یہ پتھر سواروں کے جسموں سے گزر کر ہاتھیوں کے جسموں تک پہنچ جاتے تھے۔

واقعہ کی اس حد تک پہنچ جانے کے بعد ان کو مجبوراً یہ بھی فرض کر لینا پڑا کہ ابرہہ کی پوری فوج عین موقع ہی پر تباہ ہوگئی اور یہ بربادی صرف پتھروں کے ذریعہ سے ہوئی لیکن فریق اول کے بیان میں تصریح ہے کہ جن جن کو پتھر لگے وہ چیچک میں مبتلا ہو گئے اور سب فوراً ہی ہلاک نہیں ہو گئے بلکہ وہ نہایت بدحواسی کے ساتھ بھاگے اور راستوں میں مختلف جگہوں پر نہایت بے کسی کے عالم میں انھوں نے جانیں دیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دوسرے فریق کی رائے تمام تر اس فرض پر مبنی ہے کہ سنگباری چڑیوں کی جانب سے ہوتی۔ یہ چیز ایک مرتبہ فرض کر لینے کے بعد، واقعہ کا پورا سلسلہ آپ سے آپ اسی ڈھانچہ میں ڈھل گیا۔ یہ رائے ذاتی مشاہدہ یا مشاہدہ کرنے والوں کے بیانات پر مبنی نہیں ہے۔

ذیل میں ہم ان لوگوں کے اقوال نقل کرتے ہیں جو موقع پر موجود تھے اور جنھوں نے تمام حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔

۱۰- کلام عرب کی شہادت کہ سنگباری آسمان اور ہوا سے ہوئی

چھٹی فصل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس سورہ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اس واقعہ سے اچھی طرح واقف بھی تھے اور اس پر یقین بھی رکھتے تھے، اس وجہ سے قرآن مجید نے تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ جس طرح پچھلی قوموں کے معروف و مشہور واقعات ولا دیے تھے اسی طرح اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

اب ہم اشعار عرب سے اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں اور چونکہ یہ لوگ واقعہ کے عینی شاہد ہیں، اس وجہ سے ان کے بیانات سے واقعہ کی اصلی صورت بھی سامنے آئے گی۔ یہ اشعار سیرت ابن ہشام اور بعض دوسری کتابوں میں مذکور ہیں۔ ابوقیس کہتا ہے۔

ومن صنعه یوم فیل الحبو ش اذ کلما بعثوہ رزم

اور اہل حبشہ کے ہاتھی والے دن، اس کے عجیب کرشموں میں سے یہ ہے کہ جتنا اس کو اٹھاتے تھے اتنا ہی وہ بیٹھا جاتا تھا۔

محاجنهم تحت اقرابه وقد کلموا انفه فانخرم

ان کے آنکس اس کی کمر اور پیٹ کے نیچے زخمی کر رہے تھے اور انھوں نے اس کی سونڈ زخمی کر ڈالی تھی۔

وقد جعلوا سوطه مغولا اذا یمموہ قفاہ کلم

انھوں نے گپتی کا کوڑا بنایا تھا۔ جب اس سے اس کو مارتے تھے تو وہ اس کے سر کو زخمی کر دیتی تھی۔

فارسل من ربهم حاصب یلفهم مثل لف القزم

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر "حاصب" چلی جو خس و خاشاک کی طرح ان کو لپیٹ لیتی تھی۔

صیفی بن عامر یعنی ابوقیس بن اسلت جاہلی یثربی کہتا ہے۔

قوموا فصلوا ربکم وتعوذوا باركان هذا البیت بین الاخاشب

کھڑے ہو کر اپنے رب سے دعا مانگو اور اس گھر کی پناہ لو جو پہاڑیوں کے درمیان ہے

فعندکم منه بلاء مصدق غداة ابی یکسوم هادی الکتائب

کیونکہ خدا کی طرف سے تم پر ایسا انعام ہوا جس سے تمام وعدوں کی تصدیق ہو گئی، ابو یکسوم (ابرہہ) کے دن جو دستوں کی قیادت کرتا تھا۔

فلما اجازوا بطن نعمان ردهم جنود الاله بین ساف وحاصب

جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے "ساف" اور "حاصب" کے درمیان نمودار ہو کر ان کو پسپا کر دیا۔

فولوا سراعا نادمین ولم یوب الی اهله ملجیش غیر عصائب

وہ نامراد الٹے پاؤں بھاگے اور فوج میں سے چند مختصر جماعتوں کے سوا کسی کو اپنے اہل و عیال سے ملنا نصیب نہ ہوا۔

طفیل غنوی جاہلی کہتا ہے:

ترعی بمذالف وسمی اطاع له بالجوع حیث عصی اصحابه الفیل

ابالصلت یعنی ابوامیہ بن ابی الصلت، قبیلۂ ثقیف کا جاہلی شاعر، طائف کا باشندہ ہے، ثقیف لات اور غبغب کو پوجتے تھے، ان کا ایک خاص معبد بھی تھا جس میں باقاعدہ کلید برداری وغیرہ کے مناصب تھے۔ اس معبد کی وجہ سے ثقیف اور قریش میں ایک حریفانہ چشمک تھی۔ وہ کہتا ہے:

ان ایات ربنا بینات لایماری بهن الا الکفور

ہمارے رب کی نشانیاں بالکل واضح ہیں، صرف کافر ہی ان کا انکار کر سکتے ہیں

حبس الفیل بالمغمس حتی ظل یحبو کانه معقور

اس نے ہاتھی کو مغمس میں روک دیا یہاں تک کہ وہ گھٹنوں کے بل اس طرح چلتا تھا جس طرح وہ اونٹنی جس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہوں۔

واضعا خلفه الحوار کما قطع صخر من کبکب محدور

اور اس کے پیچھے اس کا بچہ تھا جیسے کوہ کبکب سے کوئی چٹان تراش لی ہو۔

کسی نے ابرہہ کو مخاطب کر کے کہا ہے:

این المفر والاله الطالب والاشرم المغلوب غیر الغالب

اب کہاں بھاگتے ہو۔ خدا تعاقب میں ہے۔ اشرم مغلوب ہوگا۔ غالب نہ ہوگا۔

عبدالمطلب نے کوہ حرا پر چڑھ کر کہا:

لاهم ان المرء یمنع رحله فامنع رحالك

اے خدا آدمی اپنے اہل کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر

لا یغلبن صلیبهم ومحالهم ابدا محالك

ان کی صلیب اور قوت تیری قوت پر غالب نہ ہو

ان کنت تارکهم وقبلتنا فامر ما بدالك

اگر تو ہمارے قبلہ کو ان کے زیر نگین کرنا چاہتا ہے تو وہی کر جو تیری مرضی ہو

نفیل بن حبیب خثعمی جاہلی جو موقع پر موجود تھا کہتا ہے۔

الا ردی جمالك یا ردینا نعمناکم مع الاصباح عینا

اے ردینہ اپنے اونٹوں کو واپس لا۔ تمھارے دیدار سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں

فانك لو رأیت ولن تریه الی جنب المحصب ما راینا

اگر تو دیکھتی اور اب ہرگز نہیں دیکھ سکتی جو محصب کے پہلو میں ہم نے دیکھا

اکل الناس یسأل عن نفیل کان علی للحبشان دینا

ہر شخص نفیل ہی کو پوچھتا ہے گویا حبشیوں کا میں نے قرض کھایا ہے۔

حمدت الله اذ عاینت طیرا وحصب حجارۃ تلقی علینا

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب چڑیوں کو دیکھا اور ہمارے اوپر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی

مغیرہ بن عبداللہ المخزومی نے کہا ہے:

انت جلست الفیل بالمغمس حبستہ کانہ مکردس

تو نے مغمس میں ہاتھی کو روک دیا اس طرح گویا ایک آدمی کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا گیا ہو۔

محتبس تزھق فیہ الانفس

ان اشعار کو غور سے پڑھو، یہ لوگ، جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں، چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے ہیں، لیکن یہ کہیں نہیں کہتے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے، بلکہ اس سنگساری کو "حاصب" اور "ساف" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، اس وجہ سے اب ان دونوں لفظوں کی حقیقت دریافت کرنی چاہیے۔

عربی میں "حاصب" اس تند ہوا کو کہتے ہیں جو کنکریاں اور سنگریزے لا کر پاٹ دیتی ہے اور اس بادل کو بھی کہتے ہیں جس سے اولوں اور برف کی بارش ہوتی ہے، قوم لوط کے عذاب کے متعلق قرآن میں ہے إِنَّآ أَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا (ہم نے ان پر حاصب بھیجی)

مفسرین نے حاصب کے معنی ایسی تند ہوا کے لیے ہیں جو زور و شدت کی وجہ سے زمین کی کنکریاں اور سنگریزے اٹھا لیتی ہیں۔ حضرت علیؓ نے خوارج سے خطاب کر کے فرمایا "اصابکم حاصب" (تم پر حاصب چلے) اہل لغت نے اس کی تفسیر یوں کی کہ تم پر عذاب الٰہی آئے، یعنی آسمان سے تم پر سنگریزوں اور کنکریوں کی بارش ہو۔

دوسرا لفظ "ساف" ہے، چڑیوں کے لیے اس لفظ کا استعمال کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ سافی اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد و غبار، خس و خاشاک اور درختوں کی خشک پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے۔ غبار کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے اور چڑیوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ چونچوں اور چنگلوں میں غبار نہیں اٹھا سکتیں۔

ان شعروں میں یہ بھی تصریح ہے کہ اصحاب فیل نہایت ابتری کے ساتھ بھاگے، اس وجہ سے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ پتھر ان کے جسموں میں گھس جاتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو پھر سب وہیں کے وہیں ڈھیر ہو جاتے، بھاگنے کی نوبت نہ آتی۔

عین اس دن اس آندھی کا اٹھنا ایک حیرت انگیز واقعہ تھا اس وجہ سے تمام زبانوں پر اس کا چرچا پھیل گیا۔ چنانچہ ساتویں فصل میں ہم ذوالرمہ کے اشعار نقل کر آئے ہیں جس نے ایک حیرت انگیز واقعہ کی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا ہے اور پوری تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔

الغرض تمام قرائن و حالات کی شہادت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی طرح اصحاب فیل پر بھی تند ہوا کا آسمانی عذاب بھیجا، جس نے ان پر ہر طرف سے گرد و غبار کے ساتھ کنکروں اور پتھروں کی بارش کی، یہ سب اللہ تعالیٰ کے فرشتوں یا دوسرے لفظوں میں اس کی مخفی افواج کی کارفرمائی ہے۔

سورۂ ذاریات اور سورہ مرسلات میں خدا نے اسی چیز کو شہادت میں پیش کیا ہے، سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں۔

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ ان شاعروں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ چڑیاں ان کی لاشیں کھاتی تھیں۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ کی روایات میں کنایۃً اور صراحتاً دونوں طرح اس بات کا ذکر آ چکا ہے۔ باقی رہے شعراء تو ان کا عام انداز کلام اجمال و کنایہ کا ہوتا ہے، وہ زیادہ تصریح و تفصیل نہیں کیا کرتے۔ بعض نے مجملاً چڑیوں کے دیکھنے کا ذکر کر دیا ہے اور اسی قدر بس تھا، کیونکہ قتل گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں گوشت خور چڑیوں کا جمع ہونا عربوں میں ایک معلوم و مشہور بات تھی۔ وہ فوج کے ساتھ چڑیوں کے جھنڈ دیکھ کر فیصلہ کر لیتے تھے کہ لڑائی ضرور ہوگی۔ اصحاب رجیع کے قتل کی پیشین گوئی عمر بن امیہ نے اسی دلیل سے کی تھی۔ بعض شعراء فوجوں کے ذکر کے ساتھ چڑیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ چڑیوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ میدان جنگ میں بے شمار لاشیں ملیں گی، اس وجہ سے وہ بھی ساتھ ہو لی ہیں۔ مشہور شاعر نابغہ عمرو بن حارث غسانی اور اس کی قوم کا ذکر کرتا ہے۔

اذا ما غزوا بالجیش حلق فوقھم عصائب طیر تھتدی بعصائب

جب وہ فوج لے کر حملہ کرتے ہیں تو چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان کے اوپر منڈلاتے ہیں

تراھن خلف القوم خزرا عیونھا جلوس الشیوخ فی ثیاب المرانب

قوم کے پیچھے چڑیاں بیٹھی ہوئی کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہیں جیسے پوستین اوڑھے ہوئے شیوخ بیٹھے ہوں

جوانح قد ایقن ان قبیلہ اذا ما التقی الجمعان اول غالب

وہ گرا چاہتی ہیں کیونکہ ان کو یقین ہے کہ جب دو جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انہی کا قبیلہ غالب رہتا ہے

اسی مضمون کو ابونواس نے لیا ہے:

تتانی الطیر غدوتہ ثقۃ بالشبع من جزرہ

غرض، فوج کے ساتھ چڑیوں کے ہونے کا محض ذکر کر دینا کافی تھا۔ اس تصریح کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ وہ چڑیاں لاشوں کو کھاتی بھی تھیں۔ یہ بات عربوں میں ایسی جانی بوجھی ہوئی تھی کہ خود بخود سمجھ لی جاتی تھی۔

فوج اور چڑیوں کا یہ تعلق واضح ہو جانے کے بعد تصور کرو کہ جس وقت سیہ فام اور دیو ہیکل حبشیوں اور کوہ پیکر ہاتھیوں کا یہ سیلاب ظلمت، عرب کے سپید صحرا کی طرف بڑھا ہوگا تو یہ منظر کتنا خوفناک اور عجیب ہوگا۔ ناممکن ہے کہ شکاری اور گوشت خور چڑیاں، جن کے تجربہ و تفرس کی اتنی شہادتیں پڑھ آئے ہو، اس دل بادل فوج کی روانگی کے وقت چوک جائیں۔ صحرائے افریقہ کے خوفناک اور بڑے بڑے گدھ اپنے ڈراؤنے سروں اور آہنی چنگلوں کے ساتھ ضرور ان کے ہم رکاب ہو گئے ہوں گے۔ روایات سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ بعض روایات میں ہے کہ یہ پرندے سمندر کی طرف سے آئے تھے۔

تم کہو گے کہ یہ تو روزمرہ کا ایک معمولی اور عادی واقعہ ہوا پھر اس اہتمام اور اس شان کے ساتھ اس کے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، قرآن مجید میں، نوح، لوط اور عاد و ثمود کی قوموں کی بربادی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، حالانکہ ان تمام قوموں کی تباہی عام اسباب ہی کے تحت ہوئی تھی۔ حق بات یہ ہے کہ یہ واقعات

اگرچہ عام اسباب کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں، لیکن ان میں خدا کی رحمت و نقمت کی نہایت اہم داستانیں پنہاں ہیں۔

پھر قرآن مجید کا عام انداز نصیحت و موعظت بھی یہی ہے۔ وہ ہر قدم پر شب و روز کی آمد و شد، ہواؤں اور بادلوں کی گردش، شمس و قمر کے طلوع و غروب کا تذکرہ کرتا ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے روزمرہ کے آزمائے ہوئے ضابطۂ قدرت سے الگ نہیں ہوتی۔ پس جس طرح اس نے ان واقعات اور ان عجائب قدرت کا حوالہ دیا ہے، اسی طرح اصحاب فیل کی بربادی کا بھی ذکر کیا کہ اس میں مکہ اور اہل مکہ کی حفاظت، ان کے دشمنوں کی سنگریزوں اور پتھروں کے ذریعہ سے عبرت انگیز بربادی، پھر طیر ابابیل کے ذریعہ سے جوار مکہ کی تطہیر کی بے شمار نشانیاں پنہاں تھیں۔

پھر اس میں حضرت سرورِ عالم کی ولادت کی بھی ایک عظیم الشان نشانی تھی جو پچھلے صحیفوں میں مذکور ہوتی تھی۔ آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔

۱۱- آنحضرت صلعم سے متعلق ایک اہم پیشینگوئی کی تصدیق

چڑیوں کے متعلق اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید یوحنا (یحییٰ) کے مکاشفات سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کے پیروؤں کے تذکرہ کے سلسلہ میں حضرت خاتم النبیین صلعم کا بھی ذکر کیا ہے اور آپؐ سے تعلق رکھنے والے قیامت تک جو اہم واقعات پیش آئیں گے، ضمناً ان میں سے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ازاں جملہ ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ فضا کے سارے اڑنے والے پرندے خدا کی ایک بڑی ضیافت میں شریک ہوں گے۔ سورۂ ماعون کی تفسیر میں ہم نے بیان کیا ہے[1] کہ آنحضرت صلعم کے پردادا ہاشم نے چڑیوں کی میزبانی کی سنت جاری کر دی تھی۔ چنانچہ ان کو "چڑیوں کا میزبان" کہا جاتا تھا۔ اب مزید غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جو لوگ حضرت یحییٰؑ کے مکاشفہ سے واقف تھے ان کے لیے اس واقعہ میں آنحضرت صلعم کے قرب ولادت کی بشارت بھی تھی، حضرت یحییٰ کا مکاشفہ (باب ۱۹: ۱۱ - ۱۹) میں یوں مذکور ہے،

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا، اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے جو امین اور صادق (سچا اور برحق) کہلاتا ہے اور راستی کے ساتھ انصاف اور لڑائی کرتا ہے اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے ہیں اور اس کے سر پر بہت سے تاج ہیں اور اس کا ایک نام لکھا ہوا ہے جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور وہ خون کی چھڑکی ہوئی پوشاک پہنے ہوئے ہے (یعنی آپ نبی جہاد ہوں گے، نیز فتح مکہ کے وقت آپ کے جسم پر سرخ لباس تھا) اور اس کا نام کلام خدا کہلاتا ہے (غالباً یہ راویوں کا اضافہ ہے تاکہ اس مکاشفہ کے مصداق حضرت عیسیٰ ہو سکیں۔ حالانکہ بقیہ تمام باتیں ان کی زندگی کے حالات سے بالکل بے جوڑ ہیں) اور آسمان کی فوجیں سفید گھوڑوں پر سوار اور سفید اور صاف مہین کتانی کپڑے پہنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہیں (جیسا کہ غزوۂ بدر میں واقع ہوا) اور قوموں کے مارنے کے لیے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ (یعنی قرآن حکیم) اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکومت کرے گا (اس میں اشارہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی حکومت نہایت محکم عدل کی بنیاد پر قائم ہوگی اور کفار اور عہد شکن اہل کتاب آپ کی عدالت سے سزا پائیں گے، چنانچہ آنحضرت صلعم کی

---

[1] سورہ ماعون کی تفسیر مولانا رحمۃ اللہ علیہ مکمل نہیں کر سکے۔ اس وجہ سے وہ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ (مترجم)

نسبت حضرت موسیٰؑ نے بھی پیشین گوئی فرمائی ہے کہ وہ نافرمانوں پر سخت ہوگا"، اس کی کامل مثال حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا عہد خلافت ہے) اور قادر مطلق خدا کے سخت غضب کی مے کے حوض میں انگور روندے گا (چنانچہ فتح مکہ کے دن کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر آپ نے خطبہ دیا: اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنے وعدے کو پورا کیا، اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور یکہ و تنہا دشمن کے تمام جتھوں کو شکست دی۔ سن لو تمام خاندانی استحقاق اور مال اور خون کے تمام مطالبات میرے ان دونوں کے قدموں کے نیچے ہیں، صرف دو مستثنیٰ ہیں، خانہ کعبہ کی کلید برداری، اور حجاج کو پانی پلانے کی خدمت، اسی طرح عرفہ کے خطبہ میں آپ نے فرمایا، سن رکھو! جاہلیت کی ہر بات میرے ان قدموں کے نیچے روند دی گئی (مسلم) پیشینگوئی کے اس حصہ کی شرح بہت طویل ہے، یہاں محل تفصیل نہیں) اور اس کی پوشاک پر یہ نام لکھا ہوا ہے، بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند، (غالباً اس مقام پر راس الخلفاء اور سید السادات وغیرہ کے ہم معنی الفاظ ہوں گے) پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑے ہوئے دیکھا اور اس نے بڑی آواز سے چلا کر آسمان میں کے سارے اڑنے والے پرندوں سے کہا کہ آؤ، خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لیے جمع ہو جاؤ، تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت اور فوجی سرداروں کا گوشت، اور زورآوروں کا گوشت، اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کا گوشت اور سارے آدمیوں کا گوشت کھاؤ، خواہ آزاد ہوں خواہ غلام، خواہ چھوٹے ہوں خواہ بڑے۔"

اس کے بعد جو حالات بیان ہوئے ہیں، وہ بھی نبی امی صلعم کے حالات سے پوری مطابقت رکھتے ہیں لیکن زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے پیشینگوئی کو اس کی ابتدا سے نقل کیا ہے، تاکہ تطبیق حالات میں کسی کو کوئی شبہ نہ ہو۔

دیکھو! جب آنحضرت صلعم کے ظہور کا وقت قریب آیا تو اللہ تعالیٰ نے آسمان کے اڑنے والے پرندوں کو اپنی ضیافت میں شرکت کی دعوت دی۔ ممکن ہے تم کہو کہ یہ پیشینگوئی تو اخیر عہد رسالت سے متعلق ہے اور ہم جس واقعہ سے بحث کر رہے ہیں اس کا تعلق آنحضرت صلعم کے سال ولادت سے ہے؟ یہ صحیح ہے۔ ہم کو اس سے انکار نہیں، لیکن ہمارا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک مثال شروع میں دکھا دی تاکہ آپؐ کے محبوب شہر پر حملہ کے وقت آپؐ کے دشمنوں کی بربادی کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس کے متعلق آپؐ کو پورا اطمینان قلب ہو جائے۔ نیز منکرین کو فی الجملہ تنبیہ ہو جائے۔ جیسا کہ فرمایا ہے،

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔

اور اس بڑے عذاب سے پہلے ہم ان کو چھوٹے عذاب چکھائیں گے تاکہ وہ ہماری طرف رجوع ہوں۔

۱۲- تاویل میں غلط فہمی کے اسباب

اس واقعہ سے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں جو لوگوں میں مشہور ہو گئی تھیں، وہی صحیح تاویل کے لیے حجاب بن گئیں۔ اب کہ یہ تمام پردے ہٹ چکے ہیں، ضروری ہے کہ چند لفظوں میں اس غلط شہرت کے اسباب نیز بعض دوسرے وجوہ کی طرف، جو غلط فہمی کے باعث ہوئے ہیں اشارہ کر دیا جائے۔ ہر چیز کی طرح غلط فہمیوں کے بھی اسباب ہوا کرتے ہیں اور جب تک ان کو کھول کر بیان نہ کر دیا جائے اصل حقیقت پوری طرح آشکارا ہو کر سامنے نہیں آتی۔ میرے خیال میں اس کے سات اسباب ہیں۔

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ اس سورہ میں خطاب آنحضرت صلعم کی طرف ہے۔ لیکن "ترمیہم" (تم ان کو پتھر مارتے تھے) کا لفظ اس تاویل سے ابا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ معلوم ہے کہ آنحضرت صلعم پتھر مارنے والوں میں شریک نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اصل تاویل سے ہٹ کر دوسری راہوں میں نکل گئے۔ ہم فصل اول میں بیان کر آئے ہیں کہ یہاں خطاب آنحضرت صلعم کی طرف نہیں ہے، بلکہ افراد اہل مکہ کی طرف ہے اور ترمیہم کا لفظ "علیہم" کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے یا مستقل جملہ مستانفہ ہے۔ حال کی صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ "اے مخاطب دیکھ کس طرح اللہ تعالٰی نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ چڑیاں بھیجیں اور حال یہ تھا کہ تو ان پر پتھر پھینکتا تھا"۔ استیناف کی شکل میں یہ معنی ہوں گے کہ "تم ان پر پتھر پھینکتے تھے اور اللہ تعالٰی نے ان کو کھانے کے بھس کی طرح بنا دیا"۔ ہر چند دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے لیکن دونوں اسلوبوں میں ایک لطیف فرق ہے۔ حال کی شکل میں چڑیوں کے دفعۃً آجانے اور ان کی سرعت ہلاکت کی طرف اشارہ ہوگا اور استیناف میں نتیجہ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ قریش کی سنگباری سے ان کا بھس کی طرح ہو جانا ایک بالکل غیر متوقع بات ہے، جو لوگ عربی زبان کے اسالیب و قواعد سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں، ممکن ہے ان دونوں ترکیبوں کو نحو کے خلاف سمجھیں۔ ان کے اطمینان کے لیے ذیل میں مزید تفصیل آتی ہے۔

۲۔ ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال ہو کہ حال تو اہل نحو کے اصول کے مطابق فاعل یا مفعول کی ہیئت ظاہر کرتا ہے اور "علیہم" کی ضمیر مجرور نہ فاعل ہے نہ مفعول۔ نحویوں کا مذہب یہ ہے کہ حال کسی چیز کی ہیئت کسی امر کے واقع ہونے کے وقت بیان کرتا ہے اور حدوث کی تعبیر فعل سے کی جاتی ہے۔ اس لیے جب کبھی وہ فاعل یا مفعول کے علاوہ کسی اور چیز سے حال پڑا ہوا پاتے ہیں تو وہاں کے مختلف قسم کے مقدرات و محذوفات ڈھونڈھنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ مجرور سے حال پڑنا عربی زبان میں نہایت معروف ہے، قرآن مجید اور کلام عرب میں اس کی بکثرت مثالیں ہیں۔

سورۂ ق میں ہے:

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا (ق-۴۴)
جس دن کہ زمین ان کے اوپر سے کھل جائے گی اور حال یہ ہوگا کہ وہ نکلنے میں جلدی کرتے ہوں گے۔

یہاں لفظ "سراعاً" "عنہم" کی ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ امراء القیس اپنے گھوڑے کی تعریف کرتا ہے۔

فلما اجن الشمس عنی غیارھا نزلت الیہ قائما بالحضیض
جب آفتاب غروب ہوگیا تو میں اتر کے اس کے پاس آیا اور حال یہ تھا کہ وہ ہموار زمین میں کھڑا تھا

وایضاً

کان سراتہ لدی البیت قائما مداک عروس او صلایۃ حنظل
جب وہ گھوڑا گھر کے باہر کھڑا ہوتا ہے اس کی پیٹھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسی دلہن کے سہاگ پڑے پیسنے کی سل یا اندرائن کے پھل توڑنے کا چوڑا پتھر۔

اعشی کہتا ہے:

وقیامی علیہ غیر مضیع قائما بالغدو والاصال
اور صبح و شام مستعدی کے ساتھ میری طرف سے اس کی دیکھ بھال ضائع نہ ہوگی

لبید نے کہا ہے۔

باتت واسبل واکف من دیمۃ یروی الخمائل دائما تسجامھا
اور رات ایسی بسر کی کہ وہ جھڑی جو درختوں کی زمینوں اور گھاس والے ٹیلوں کو تر و تازہ کرے برابر لگی رہی

نابغہ بنی جعدہ کا شعر ہے:

تلالأ کالشعری العبور توقدت فکان عماء دونھا فتحسرا
وہ چمکا جیسے شعری عبور ابر سے نکل کر چمک گیا ہو

ونھنھتہ حتی لبست مفاضۃ مضاعفۃ کالنھی ریح وامطرا
میں نے اس کو روکا یہاں تک کہ ایک ڈھیلی ڈھالی زرہ پہنی جس میں اس تالاب کی سی لہریں تھیں جس پر ہوا چل گئی ہو اور پانی برس گیا ہو

ابو ذویب ہذلی کہتا ہے:

ملیاتین علیک یوم مرۃ یبکی علیک مقنعا لا تسمع
تم پر ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تم کو دفن کر کے تم پر ماتم کیا جائے گا اور تم کچھ سن نہ سکو گے

یہ چند مثالیں کافی ہیں اس لیے بس کرتا ہوں، ورنہ کلام عرب میں اس کے نظائر بکثرت ہیں۔

۳۔ "تَرْمِيْهِمْ" سے استیناف ماننے کی صورت میں ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہاں مفہوم کا تقاضا یہ تھا کہ ماضی کا صیغہ استعمال ہوتا، حالانکہ "تَرْمِيْهِمْ" مضارع ہے، یہ شبہ بجا ہے۔ لیکن ترمیہم اصل میں "کنت ترمیہم" ہے۔ عربی میں مضارع سے پہلے افعال ناقصہ کے حذف کر دینے کا قاعدہ نہایت معروف ہے اور اس کے مخصوص مواقع ہیں جن میں حذف ہی بہتر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ اس بحث کے لیے موزوں نہیں "کِتَابُ الْاَسَالِيْبُ" میں اس کو مفصل لکھ چکا ہوں۔ اس وجہ سے قرآن مجید اور کلام عرب کی چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

وَسَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (الحاقۃ-۷)
اور خدا وند نے ان پر سات رات اور آٹھ دن اکھاڑ پھینکنے والی آندھی مسلط رکھی، پس اے مخاطب اگر تو وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ لوگ اس طرح پڑے ہوئے ہیں جیسے کھوکھلی کھجوروں کے بڑے۔

متمم بن نویرہ کا شعر ہے:

تقول ابنۃ العمری مالک بعد ما اراک قدیما ناعم الوجہ افرعا
عمری کی بیٹی کہتی ہے یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے میں تمہیں نہایت ہشاش بشاش اور آراستہ زلفوں والا دیکھتی تھی۔

خداش بن زہیر بن ربیعہ کہتا ہے:

تفاد وقد ترعی بھا امر دافع مذ ابنھا بین الاسلۃ والصخر

اب سب چٹیل میدان ہے۔ حالانکہ وہاں ام رافع وادیوں اور پہاڑیوں کے درمیان پانی بہنے کی جگہوں پر اونٹ چرایا کرتی تھی۔

اعشیٰ بکر بن وائل کہتا ہے:

فلئن شطّ بی المزار لقد اضحٰی قلیل الھموم فاعم بالی

اب اگر فراق کی گھڑیاں جھیل رہا ہوں تو کچھ افسوس نہیں۔ وہ بھی دن تھے جب میں بالکل بے غم اور ہشاش بشاش رہتا تھا۔

قطامی کہتا ہے:

کانت منازل منا قد نحل بھا — حتی تغیر دھر خائن خبل

یہ سب ہماری منزلیں تھیں، جن میں ہم اترتے تھے یہاں تک کہ گردش روزگار نے تمام نقشہ ہی بدل دیا

حطیئہ کا شعر ہے:

ترکت المیاہ من تمیم بلاقعا — بما قد تری منھم حلولا کراکرہ

تو نے تمیم کے تمام چشمے سنسان سے خالی کرا لیے حالانکہ اس سے پہلے وہاں ان کی بڑی جمعیت مقیم تھی

اس لیے "تَرْمِیْھِمْ" کو خواہ حال مانو یا استیناف دونوں صورتوں میں سے کسی میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ اور جب دونوں شکلوں میں، معناً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا تو کچھ حرج نہیں اگر دونوں ہی احتمالات باقی رکھے جائیں۔

۴۔ چڑیوں کا پتھر مارنا ایک اچنبھے اور حیرت کی بات تھی۔ اس طرح کی بات سننے اور ماننے کے لیے عوام کا ہمیشہ گوش بر آواز رہا کرتے ہیں، زبان سے نکلی اور افسانۂ بزم و انجمن ہوئی۔ پھر ایسی باتوں پر لوگ اس جزم و یقین کے ساتھ ایمان لاتے ہیں کہ ان کے متعلق کسی قسم کا غور و بحث، تقویٰ اور دینداری کے خلاف سمجھا جانے لگتا ہے۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ معجزہ کے لیے ندرت اور اعجوبہ پن کوئی لازمی چیز نہیں ہے بلکہ اس کو اس کے امثال و نظائر پر قیاس کرنا زیادہ بہتر ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے مٹھی بھر راکھ اپنے ہاتھوں سے اڑا دی اور آنحضرت صلعم نے مٹھی بھر کنکری کفار کے چہروں پر اپنے دست مبارک سے پھینکی۔ بظاہر یہ معمولی واقعات ہیں، تاہم دیکھو یہ دونوں نہایت عظیم الشان معجزے ہیں۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ خوارق و معجزات اسباب و علل کی آڑ سے ہی نمودار ہوا کرتے ہیں۔

۵۔ بعض لوگ، جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں، انھوں نے چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے اس سے بعض سننے والوں کو گمان ہوا کہ یہ پتھر چڑیوں ہی نے پھینکے۔ اور ممکن ہے کہ بعض دیکھنے والوں کو بھی یہ شبہ ہوا ہو اور انھوں نے اپنے خیال کے مطابق، واقعہ کو بیان کر دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا عذر واضح ہے، سنگباری کے جو نتائج ظہور میں آئے وہ عربوں کی سنگباری کے اعتبار سے بہت زیادہ تھے۔ ابرہہ کی پوری فوج کا بھس کی طرح پامال ہو جانا قریش کی سنگ اندازی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو خیال ہوا ہوگا کہ یہ سنگباری آسمان سے ہو رہی ہے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو تمام فضا چڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس وجہ سے خیال ہوا ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ انھی چڑیوں کا کرشمہ ہے۔ بعد میں جن لوگوں نے یہ روایت سنی، انھوں نے آیت کو بھی اسی پر محمول کر دیا۔ حالانکہ یہ سمجھنا زیادہ صحیح تھا کہ یہ آسمانی سنگباری عربوں کی سنگباری کے پردہ میں ہوئی، جیسا کہ آٹھویں فصل میں گزر چکا ہے۔

۶۔ ابرہہ اور عبد المطلب کے مابین جو واقعات پیش آئے، قصہ گویوں کی حاشیہ آرائیوں نے ان کی صورت بالکل مسخ کر دی تھی اور ہمارے مفسرین چونکہ قصوں کے بارے میں، زیادہ بحث و تحقیق کے عادی نہیں ہیں اس وجہ سے انھوں نے انھی بے سر و پا باتوں پر اعتماد کر لیا۔ حالانکہ از روئے روایت و درایت ان میں سے ایک بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی تھی۔ جب یہ بات دلوں میں بیٹھ گئی کہ اہل مکہ نے ابرہہ کی مدافعت نہیں کی، بلکہ نہایت بے حمیتی سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپے، تو اس خیال کے بعد ترمیھم کا مخاطب اہل مکہ کو سمجھنا بالکل ناممکن ہو گیا اور صرف یہی شکل باقی رہ گئی کہ اس کا فاعل طیر کو مانا جائے۔

۷۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ لفظ "تَرْمِیْھِمْ"، "طَیْرًا اَبَابِیْلَ" سے بالکل متصل ہے۔ اس قربت کی وجہ سے یہی خیال ہوا کہ ضمیر فاعل طیر ہی کی طرف راجع ہوتی ہے۔ اس ظاہر اور متبادر مفہوم کو غور و تامل کے بعد ہی چھوڑنا ممکن تھا۔ اور آدمی تامل اس جگہ کرتا ہے جہاں کوئی ظاہری اشکال ہو۔ یہاں کوئی ظاہری اشکال نہیں تھا۔ اس وجہ سے وہی تاویل چل گئی۔ حالانکہ کامل غور و فکر کے بعد اس کی غلطیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۳۔ سنگسار کرنا لعنت ہے

دشمن کو سنگسار کرنا یا اس کے منہ پر خاک جھونکنا لعنت کرنے اور بد دعا دینے کا ایک طریقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدر میں جب آنحضرت صلعم نے کفار کی طرف کنکریاں پھینکیں تو فرمایا "شاھت الوجوہ" (خدایا یہ چہرے مسخ ہو جائیں) اسی طرح لعنت کے مواقع پر "قبح اللہ وجھک" کہتے ہیں۔ عربی میں محاورہ ہے، بینھم قذف یعنی (ان میں آپس میں گالم گلوچ اور سنگ اندازی ہوئی) اسی وجہ سے عفیف عورتوں پر تہمت لگانے کے لیے عربی میں "قذف" کا لفظ ہے۔ خود لعنت کا مفہوم بھی "رمی" سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کا اصلی مفہوم ذلت سے دھتکارنا ہے جس طرح ہم کتے کو پتھر مار کر دور کرتے ہیں۔ سنگسار کرنا قدیم زمانہ سے اظہار لعنت کا طریقہ رہا ہے۔ بنی اسرائیل کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ سموئیل ۲ ب ۱۶ : ۵۔ ۱۴ میں ہے:

پھر وہاں سے داؤد بادشاہ بحوریم میں آیا اور وہاں سے ساؤل (طالوت) کے گھر کے لوگوں میں سے ایک شخص جس کا نام سمعی بن جیرا تھا، نکلا۔ لعنت کرتے ہوئے چلا جاتا تھا اور اس نے داؤد پر اور داؤد بادشاہ کے سارے خادموں پر پتھر پھینکے، اور اس وقت سارے بہادر اور سب لوگ اس کے دہنے اور بائیں ہاتھ تھے اور سمعی لعنت کرتے ہوئے یوں کہتا تھا دور ہو دور ہو اے خونی مرد، اے خبیث، خداوند نے ساؤل کے گھر کے سارے خون کو کہ جس کے عوض تو بادشاہ ہوا، تجھ پر پھیرا اور خداوند نے تیری سلطنت تیرے بیٹے ابی سلوم کے ہاتھ دی اور دیکھ تو اپنی بدی میں گرفتار ہے، اس لیے کہ تو خونی مرد ہے تب ضرویاہ کے بیٹے ابیشے نے بادشاہ کو کہا کہ یہ مرا ہوا کتا کاہے کو میرے خداوند بادشاہ پر لعنت کرے حکم ہو تو میں جاؤں اور اس کا سر اڑا دوں، بادشاہ نے کہا اے بنی ضرویاہ مجھ کو تم سے کیا کام؟ اسے لعنت کرنے دو، کہ خداوند نے اسے کہا ہے کہ داؤد پر لعنت کرے، پس کون کہہ سکتا ہے کہ تو نے کیوں ایسا کیا؟ اور داؤد نے ابیشے اور اپنے سب چاکروں کو کہا دیکھ میرا بیٹا جو میری صلب سے پیدا ہوا میری جان کا طالب ہے، پس اب یہ بنیمینی کیا کچھ نہ کرے گا، اسے چھوڑ دو اور لعنت کرنے دو کہ خداوند نے اسے کہا ہے شاید کہ خداوند میرے دکھ پر نظر کرے اور خداوند آج کے دن

اس کی لعنت کے بدلہ میں مجھ سے نیکی کرنے اور جس وقت داؤد اور اس کے لوگ راہ میں چلے جاتے تھے تو سمعی پہاڑ کی طرف اس کے برابر گزرتا تھا، اور لعنت کرتا تھا اور اس کی طرف پتھر مارتا تھا اور خاک پھینکتا تھا اور بادشاہ اور اس کے سارے ہمراہی تھکے ہوئے آئے اور وہاں انھوں نے دم لیا۔"

اس کے اول اور آخیر حصہ پر غور کرو۔ اس میں اس بات کی نہایت واضح دلیل موجود ہے کہ کسی پر پتھر پھینکنا اور خاک جھونکنا اس پر لعنت کرنے کی علامت ہے۔

اس قسم کا ایک واقعہ آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کے ساتھ پیش آیا۔ مربع قیظی ایک اندھا منافق تھا۔ ایک روز آنحضرت صلعم صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ احد کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ جب آپؐ اس کے مکان کے پاس پہنچے اور اس نے کچھ آہٹ پائی تو اٹھ کر آپؐ پر اور آپؐ کے صحابہ پر خاک پھینکنے لگا۔ یہ دیکھ کر بعض لوگ جھپٹے کہ اس کا سر قلم کر دیں۔ لیکن آپؐ نے روک دیا، کہ ایسا نہ کرو اور فرمایا کہ یہ آنکھوں کا اندھا دل کا بھی اندھا ہے اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رجم کو بدترین سزا قرار دیا ہے اور اس کو صرف بدترین جرائم ہی کے لیے مخصوص فرمایا ہے۔ تورات میں والدین کی نافرمانی اور خیانت کی سزا رجم ہے، تاکہ یہ سزا کے ساتھ ساتھ لعنت بھی ہو۔ لوط کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے رجم کی سزا دی۔ اسی طرح اصحاب فیل کو سنگسار کیا تاکہ یہ سزا بھی ہو اور لعنت بھی۔ یہ لوگ نصرانیت کے مدعی تھے اس وجہ سے ان کا فرض تھا کہ یہ اس گھر کی عزت کرتے جس کو ابراہیمؑ نے تعمیر فرمایا تھا، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ بھی اسی طرح بزرگ مانتے تھے جس طرح اہل عرب ان کو اپنا بزرگ مانتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس چیز کی پروا نہ کی اور اس گھر کی عزت برباد کرنے کے لیے اس پر فوج لے کر چڑھ دوڑے چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا ہے:-

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ان لوگوں سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر کو روکیں۔ اور ان کی بربادی کے درپے ہوں۔ ان کے لیے جائز نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ڈرتے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

اسی طرح بدر میں کفار کو بھی سنگسار کیا گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کو بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ شیطان کی صفت رجیم بتائی گئی ہے کیوں کہ وہ سب سے بڑا ملعون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرکشی کی وجہ سے اس کو جنت سے نکالا اور اس کو قیامت تک کے لیے ملعون قرار دیا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۚ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ○

فرمایا تو جنت سے نکل، تو مردود ہے، تجھ پر روز جزا تک اللہ کی پھٹکار ہے۔

یہاں اخراج اور لعنت کے بیچ میں "رجیم" (سنگسار کردہ) کا لفظ ہے جس سے لعنت کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ شیطان تمام ملعونوں کا سردار ہے اس وجہ سے لوگوں کو خیال ہوا کہ منیٰ میں "رمی جمرہ" کا تعلق شیطان ہی سے ہے اور پھر یہیں سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس کی فریب کاریوں کا قصہ پیدا ہو گیا۔ اگلی فصل میں ہم اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

۱۴۔ منیٰ میں رمی جمرہ کی حقیقت

بہت سے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ منیٰ میں رمی جمرہ واقعہ فیل ہی کی یادگار ہے لیکن ضعیف روایات نے اس حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں کہ "روایت ہے کہ مینڈھا حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ سے چھوٹ بھاگا۔ انھوں نے اس کو سات کنکریاں ماریں اور پھر پکڑ لیا۔ اس کے بعد سے یہ رمی کی سنت قائم ہو گئی۔"

دوسری روایت یہ ہے کہ جس وقت انھوں نے بیٹے کی قربانی کا قصد کیا تو شیطان نے ان کو بہکانا چاہا۔ اس وقت انھوں نے اس کو کنکریاں ماریں اور رمی جمرہ کی سنت اس واقعہ کی یادگار ہے۔

ابن جریرؒ نے اسی قسم کی ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ چونکہ مینڈھا حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نکل بھاگا تھا اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے اس کو جمرہ اولیٰ، جمرہ وسطیٰ اور جمرہ کبریٰ کے پاس سات سات کنکریاں ماریں۔

پھر ایک دوسری روایت حضرت علیؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مینڈھے کو ثبیر میں ایک ببول کے درخت سے بندھا ہوا پایا۔ اس روایت کی تائید تورات سے بھی ہوتی ہے۔ تورات میں ہے:

"ابراہیم نے آنکھ اٹھائی اور دیکھا کہ مینڈھا سامنے جھاڑی میں دونوں سینگوں سے بندھا ہوا ہے پس وہ گیا اور اس کو پکڑا۔"

بہرحال مینڈھے کے بھاگنے کی روایت بالکل بے بنیاد ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ نے جمرہ کے پاس ابلیس کو سنگسار کیا تھا۔ لیکن صحیح روایات میں سنت رمی جمرہ کی اصل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اگر اس کے متعلق کوئی بات صحیح روایات سے ثابت ہوتی تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی تھی۔ لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے، اس کے متعلق کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اس وجہ سے اس کے معاملہ میں ہر قسم کی روایات پر اعتماد کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جو بات سن پائے اس کو بیان کرنے لگ جائے۔ اس وجہ سے ہم نے استنباط کی راہ اختیار کی ہے۔ صحیح و ثابت چیزوں سے استنباط، اس صریح روایت سے زیادہ بہتر ہے جو ثابت نہ ہو۔ خدا نے ہم کو جا بجا تفکر و تدبر کی دعوت دی ہے تاکہ ہم بے تحقیق باتوں پر اعتماد کرنے کے بجائے غور و فکر سے کام لیں۔

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ○

اس میں غور کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اب ہم اپنے وجوہِ استنباط کی تفصیل کرتے ہیں۔

۱۔ حج اور اس کے تمام مناسک حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلے آ رہے ہیں۔ عربوں نے تمام مناسک حج انہی سے سیکھے ہیں۔ چنانچہ کلام جاہلیت میں اجمالاً و تفصیلاً ان تمام باتوں کا ذکر موجود ہے۔ احرام، استلام، طواف، طیرِ حرم، صفا و مروہ، ہدی و نحر، زیارت عرفہ، وقوفِ منیٰ، غرض خانہ کعبہ اور حج سے متعلق ساری چیزوں کا ذکر آپ کو شعرائے جاہلیت کے شعروں میں مل جائے گا۔ تفسیر آل عمران میں ہم تمام شواہد نقل کر چکے ہیں۔ یہاں ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ کلام جاہلیت میں رمی جمرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی چیز ہے اور واقعہ فیل کے بعد وجود میں آئی ہے۔ چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے احسان کی یادگار ہے اور اس کی قدرتِ قاہرہ کی ایک عظیم الشان نشانی تھی

اس وجہ سے اسلام نے اس کو باقی رکھا اور حج کے مراسم میں شامل ہو کر اس نے تکبیر و تہلیل کی ایک مخصوص سنت کی حیثیت حاصل کر لی۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے[1]

۲۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ثابت ہے کہ اصحاب فیل پر سنگباری وہیں ہوئی تھی جہاں رمی کی سنت ادا کی جاتی ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رمی مُحَصَّب کے ایک حصہ میں ہوتی ہے اور مُحَصَّب منیٰ میں شامل ہے۔ لسان العرب میں اصمعی کا قول ہے کہ محصب وہ جگہ ہے جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس نے ثبوت میں یہ شعر پیش کیے ہیں۔

اقام ثلاثا بالمحصب من منی ولما یبن للناعجات طریق

اس نے محصب میں، جو منیٰ میں ہے تین دن قیام کیا اور اونٹنیوں کی راہیں ابھی رکی ہوئی تھیں

راعی کا شعر ہے:

الم تعلمی یا الأم الناس اننی بمکة معروف وعند المحصب

ارذل خلائق! تجھے خبر نہیں کہ میں مکہ اور محصب ہر جگہ مشہور رہوں

اس نے مُحَصَّب سے رمی جمرہ کے مقام کو مراد لیا ہے۔ اس کی مزید تائید عمر بن ربیعہ کے شعر سے ہوتی ہے۔

نظرت الیها بالمحصب من منی ولی نظر لولا التحرج عازم

میں نے اس کی طرف محصب، جو منیٰ میں ہے، دیکھا اور اگر مجھے اندیشۂ معصیت نہ ہوتا تو میری نگاہ واپس نہ آتی

اس مقام کو محصب اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہاں کنکریاں بہت زیادہ ہیں۔ لسان العرب میں ہے:

"حصب الموضع" کے معنی یہ ہوئے کہ وہاں چھوٹی چھوٹی کنکریاں لاکر بچھا دیں۔" حدیث میں ہے "ان عمرؓ امر بتحصیب المسجد (حضرت عمرؓ نے مسجد میں کنکریاں بچھانے کا حکم دیا)

الغرض یہ بات بالتحقیق ثابت ہے کہ اصحاب فیل پر سنگباری محصب کے پاس ہوئی۔ نفیل، جو اس واقعہ کے عینی شاہدوں میں سے ہے، کہتا ہے:

ردینہ لو رایت ولن تریه لدی جنب المحصب ما رأینا

ردینہ کاش تو دیکھ لیتی۔ اور اب ہرگز نہیں دیکھ سکتی، جو محصب کے پہلو میں ہم نے دیکھا

---

[1] اخرج الحاکم فی صحیحه عن عائشة انها قالت افاض رسول الله صلعم من اخر یومه حین صلی الظهر ثم رجع فمکث بمنی لیالی ایام التشریق یومی الجمرة اذا زالت الشمس کل جمرة بسبع حصیات یکبر مع کل حصاة ویقف عند الاولی وعند الثانیه فیطیل القیام ویتضرع ثم یرمی الثالثة ولا یقف عندها۔

آنحضرت صلعم ایام تشریق میں منیٰ میں ٹھہرے، زوال کے بعد آپ رمی جمرہ کرتے۔ ہر جمرہ میں سات کنکریاں مارتے۔ اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر فرماتے۔ جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ ثانیہ کے پاس وقوف کر کے دیر تک دعا و تضرع فرماتے۔ جمرہ ثالثہ کے پاس وقوف نہ فرماتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب فیل کی بربادی کی جگہ رمی کی جگہ سے بالکل قریب ہی تھی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ واقعہ وادی محسر میں پیش آیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے وادی محسر کی وجہ تسمیہ بھی یہی بیان کی ہے کہ اس مقام پر اصحاب الفیل کا ہاتھی تھک کر عاجز آگیا تھا اس وجہ سے اس کا نام محسّر ہوا۔ عربی میں "حسرت الدابہ" (جانور تھک گیا) "حسر الدابہ" (جانور کو تھکا دیا) استعمال ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ محسّر مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ صحاح میں روایت ہے کہ آنحضرت صلعم مزدلفہ سے نہایت وقار و سکون کے ساتھ چلے۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی سکون کے ساتھ چلنے کا حکم دیا، لیکن جب وادی محسر میں پہنچے تو آپ نے رفتار تیز کر دی (دیکھو ترمذی و صحیح مسلم) علماء نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ محسر اصحاب فیل کے عذاب کی جگہ تھی اس وجہ سے آنحضرت صلعم نے وہاں سے جلد نکل جانا چاہا۔ اس کی تائید امام شافعی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو کتاب الام وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ بطن محسر میں سواری کو تیز کر دیا کرتے تھے، اور یہ شعر پڑھتے تھے۔

الیک تعدو قلقا وضینها مخالفا دین النصاری دینها

وہ تیری طرف دوڑ رہی ہے، اس حالت میں کہ اس کا تنگ ڈھیلا ہو چکا ہے۔ اس کا دین نصاریٰ کے دین کے خلاف ہے

حضرت عمرؓ کا منشا یہ ہے کہ اے پروردگار جس طرح ایک غلام اپنے آقا کی طرف مستعدی اور سرگرمی سے بڑھتا ہے، اسی طرح میں بھی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ تیرے حضور میں حاضر ہو رہا ہوں۔ تقاضائے ادب تو یہ تھا کہ نہایت وقار و سکون کے ساتھ قدم اٹھاتا، جیسا کہ تو نے تعلیم فرمایا ہے فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (اللہ کے ذکر کی طرف مستعدی سے بڑھو) لیکن میں نے ناقہ کو تیز چلا دیا ہے کہ اس وادی سے جلد نکل جاؤں جس میں تو نے ان نصاریٰ کو برباد کیا جو تیرا گھر ڈھانے کے ارادے سے آئے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ناقہ کو تیز چلانے کی دو وجہیں بیان کیں۔

۱۔ یہ عذاب کی جگہ ہے اور ایسی جگہ سے جلد نکل جانا ہی قرین تقویٰ ہے۔

۲۔ اصحاب فیل کو یہاں مجبوراً رکنا پڑا تھا، اس وجہ سے یہاں سے جلد نکل جانے میں گویا ان کی مخالفت ہے۔

ان تمام باتوں کی نسبت ناقہ کی طرف مجازاً کی گئی ہے۔

وادی محسر میں جلدی کرنا سلف کا مذہب رہا ہے۔ چنانچہ وہاں ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ موطا میں ہے: "مزدلفہ، وادی محسر کے سوا تمام ٹھہرنے کی جگہ ہے"۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ حجاج کو صرف منیٰ میں شب بسر کرنی چاہیے اور منیٰ عقبہ کے پاس ہے اور عقبہ بطن محسر تک منیٰ میں نہیں ہے اور نہ بطن محسر منیٰ میں ہے۔" صحیح مسلم میں ہے کہ محسر منیٰ میں ہے۔ بہرصورت اتنا ثابت ہے کہ بطن محسر منیٰ سے متصل ہے۔ چونکہ ابرہہ کی فوج محسر میں تھی اور وہ مکہ کی طرف بڑھ رہی تھی، اس وجہ سے لازماً اس کا مقدمۃ الجیش محصب میں رہا ہوگا، جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس قدر تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات بہت لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ سنت رمی عربوں کی اس سنگباری کی یادگار ہو جو انھوں نے ابرہہ کے مقدمۃ الجیش یا اس کے ہاتھیوں پر کی تھی اور جس کے پردہ میں خدا نے آسمان سے ان پر سنگباری کی۔

۳ - یہ بالاتفاق طے شدہ ہے کہ قربانی کی سنت حضرت ابراہیم کی قربانی کی یادگار ہے۔ اس وجہ سے اگر رمی کی اصل وہ ہوتی جو لوگوں نے سمجھا ہے یعنی شیطان کو سنگسار کرنا، تو قربانی رمی سے فارغ ہونے کے بعد تیسرے یا چوتھے دن ہونی چاہیے تھی، حالانکہ قربانی رمی کے پہلے ہی دن ہوتی ہے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شیطان دوسرے اور تیسرے دن کیوں سنگسار کیا جاتا ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ اس سے پہلے ہی شیطان کو سنگسار کر کے بیٹے کی قربانی سے فارغ اور اپنے دشمن کے فریبوں سے مامون ہو چکے تھے؟ ہاں اگر اس کو واقعہ فیل کی یادگار مانا جائے تو تمام گتھیاں آپ سے آپ سلجھ جاتی ہیں۔

ابرہہ کی فوج پر پہلے روز جو سنگباری ہوئی ہوگی، اس سے ایک حد تک نقصان اٹھا کر وہ آگے بڑھنے سے رک گئی ہوگی اور حجاج نے منیٰ میں واپس آکر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور قربانی اور تکبیر و تہلیل کے فرائض ادا کیے ہوں گے۔ لیکن ابھی دم خم باقی رہا ہوگا۔ اس وجہ سے دوسرے دن پھر مکہ پر حملہ کرنا چاہا ہوگا لیکن حجاج نے آگے بڑھ کر پھر پتھراؤ کر کے روک دیا ہوگا۔ یہی واقعہ تیسرے روز بھی پیش آیا ہوگا یہاں تک کہ حجاج کی سنگ باری اور دستِ غیب کی کارفرمائیوں نے پوری فوج کو بالکل پامال کر دیا۔

۴ - چوتھی قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ رمی کے تینوں دنوں میں سے پہلے دن صرف اس ستون پر کنکریاں مارتے ہیں، جو عقبہ کے پاس اور تینوں ستونوں میں مکہ سے قریب تر ہے۔ اس روز بقیہ دونوں ستونوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ غور کرو تو واقعہ کی فطری ترتیب کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اصحاب فیل پہلے جوش میں تو مکہ کی طرف بڑھے ہوں گے اور مذکورہ حد تک پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن جب عربوں نے پتھراؤ کر کے چہرے بگاڑ دیے ہوں گے تو ان کا نشۂ جنگ تو ہرن ہو گیا ہوگا لیکن عربوں کا جوشِ مدافعت مضاعف ہو گیا ہوگا اور حوصلہ بڑھ جانے کے سبب سے دوسرے دن انھوں نے اور آگے بڑھ کر مورچہ قائم کر لیا ہوگا۔

۵ - جس ستون پر پہلے روز رمی کی جاتی ہے وہ تینوں میں سے سب سے بڑا ہے اور فوج کے حالات، کے لحاظ سے یہی ہونا بھی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ پہلے دن کی شکست اور پامالی نے مقدمۃ الجیش کے حملہ آوروں کی تعداد بہت گھٹا دی ہوگی۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ دوسرے ستون کا حجم پہلے کے مقابل میں کم ہو کہ واقعہ کی پوری تصویر یادگار کے آئینہ میں محفوظ رہے۔ ان باتوں کو شیطان کے حالات سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ جو شیطان حضرت ابراہیمؑ کو بہکانے آیا تھا اس کی یادگار میں یہ ترتیبی تفاوت بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

۶ - پہلے اور دوسرے دن رمی کے بعد کعبہ کی طرف رُخ کر کے دیر تک دعا کی جاتی ہے۔ لیکن تیسرے دن کی رمی وقوف و دعا سے خالی ہوتی ہے۔ اگر یہ رمی شیطان پر ہوتی تو نہ تو دو پہلے دنوں میں اس درجہ اہتمام دعا کی کوئی وجہ تھی نہ تیسرے دن یک قلم ترک کی۔ حضرت ابراہیمؑ کا ارادۂ قربانی بالکل اٹل تھا۔ وہ اپنے دل میں کوئی شائبۂ تذبذب نہیں پا رہے تھے۔ اگر شیطان کو سنگسار کرنے کا واقعہ سچ بھی ہے تو بھی یہ بات محض لعنت اور تحقیر کے لیے ہو سکتی ہے۔ ورنہ ان کا عزم تو بالکل غیر متزلزل تھا۔ البتہ اگر یہ رمی ابرہہ کی دل بادل فوج پر مانی جائے تو اس طویل تضرع و زاری اور اہتمام دعا کی حکمت واضح ہو جاتی ہے کیونکہ ابرہہ کی فوج، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ قریباً ساٹھ ہزار تھی۔ ایک ایسے لشکر گراں کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعا مانگنا اور نہایت تضرع و زاری کے ساتھ خدا کے سامنے دیر تک گڑگڑانا بالکل قرین عقل ہے اور یہ بات

دسویں فصل میں گزر بھی چکی ہے کہ عبدالمطلب نے ابرہہ کے مقابل میں فتح و نصرت کی دعا مانگی تھی۔ واقعات کا سلسلہ اس حد تک سمجھ جانے کے بعد یہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ تیسرے دن جب ابرہہ کی تمام جمعیت پارہ پارہ ہو کر تتر بتر ہو گئی ہوگی تو حجاج ان پر بددعا کرنے سے رک گئے ہوں گے۔

۷ - لفظ جمرہ کی معنوی خصوصیات اور دلالتیں بھی ہمارے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ عربی زبان کسی حقیقت کی تعبیر میں تمام زبانوں سے ممتاز ہے۔ کتابوں میں جمرات کی وجہ تسمیہ سے متعلق مختلف توجیہات مذکور ہیں۔ موطا کی شرح زرقانی میں ہے۔

”جمرات جمرہ کی جمع ہے۔ جمرہ اس جگہ کو کہتے ہیں، جہاں کنکریوں کا انبار ہو۔ چونکہ یہ لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی اس لیے اس کو جمرہ کہنے لگے۔ عربی میں کہتے ہیں تجمر بنو فلان (فلاں قبیلہ کے لوگ جمع ہو گئے) ایک قول یہ بھی ہے کہ اہل عرب چھوٹی کنکریوں کو جمار کہتے ہیں۔ اس وجہ سے تسمیہ باللازم کے اصول پر ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام یا حضرت ابراہیم کے پاس جب شیطان آیا تو انھوں نے اس کے کنکریاں ماریں اور وہ بھاگا۔ بھاگنے کے لیے عربی میں جمر کا لفظ ہے۔ اس وجہ سے ان جگہوں کو جمرات کہنے لگے۔ شہاب قرانی کہتے ہیں: جمار جگہ کو نہیں بلکہ کنکریوں کو کہتے ہیں۔ جمرہ کے معنی کنکری کے ہیں۔ چونکہ ان جگہوں پہ کنکریاں زیادہ تھیں اس سبب سے بلحاظ مظروف ان کو جمرات کہنے لگے۔“

زرقانی نے جو توجیہ پہلے بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔ اسی وجہ سے اس کو اس نے مقدم رکھا ہے۔ لسان العرب میں یہ توجیہات بیان کی گئی ہیں۔

”جمرہ اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو دوسرے قبائل میں ضم نہ ہو۔ بعضوں نے کہا ہے کہ جمرہ اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو دوسرے قبائل سے برابر نبرد آزما رہے۔ جس میں تین سو کے لگ بھگ شہسوار ہوں۔ جمرہ کا اطلاق ہزار سواروں پر ہوتا ہے۔“

پھر لسان العرب ہی میں ہے:

جمرہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی ایک قبیلہ اپنے تمام حریف قبائل کے مقابل میں اقدام کے لیے مجتمع ہو۔ یہیں سے منیٰ کے ان مقامات کو جہاں کنکریاں ماری جاتی ہیں، جمرات کہنے لگے۔ گویا کنکریوں کا ہر انبار ایک جمرہ ہے، یہ جمرات تین ہیں۔ عمر بن بحر کا قول ہے کہ قبیلہ عبس، ضبہ اور نمیر کو جمرات کہتے ہیں۔ دلیل میں ابو حیہ نمیری کے یہ شعر پیش کیے ہیں۔

لنا جمرات لیس فی الارض مثلها کرام وقد جربن کل التجارب

ہمارے پاس جمرات ہیں جن کا ثانی دنیا میں نہیں۔ شریف اور ہر قسم کے حالات آزمائے ہوئے۔

نمیر وعبس یتقی نفیا نها وضبة قوم باسهم غیر کاذب

نمیر اور عبس جن کے حملے خوفناک ہیں۔ اور ضبہ جن کا جوش بالکل سچا ہے۔

آگے بڑھ کر مزید تشریح ان لفظوں میں کی ہے:

”حضرت عمرؓ کی حدیث میں ہے ”لا لحقن کل قوم بجمو تهم“ اس میں انھوں نے جمرہ کا لفظ جماعت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اجمروا علی الامیر و تجمروا، تجمعوا علیه و انضموا، سب ایک ہی مفہوم کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔“

ان اقوال میں اگرچہ تھوڑا بہت اختلاف ہے لیکن اتنا واضح ہے کہ جمرہ ایسی جمعیت کو کہتے ہیں جس میں اپنی قوت و شوکت پر اس درجہ اعتماد ہو کہ کسی دوسری جماعت سے وابستہ ہونے کی وہ ضرورت نہ محسوس کرے۔ لفظ کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد، تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس کا بہترین مصداق صرف ابرہہ کی فوج ہی ہو سکتی ہے۔ جو تمام قبائل سے بے نیاز ہو کر، صرف اپنی طاقت کے بھروسہ پر عرب پر ٹوٹ پڑی تھی اور چونکہ منیٰ کے ستون اسی کی یادگار تھے اس وجہ سے ان کو جمرات کہا گیا۔

ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ ابورغال جس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا، اسی موقع پر سنگسار کیا گیا تھا اور اس کے بعد اہل عرب، برابر اس کی قبر کو سنگسار کرتے رہے ہے معجم البلدان میں مغمس کے ذکر میں ہے:

"یہ مکہ کے قریب، طائف کے راستہ میں ایک جگہ ہے۔ ابورغال یہیں مرا۔ چونکہ اس نے ابرہہ کو رستہ بتایا تھا اس وجہ سے اس کی قبر سنگسار کی جاتی ہے۔"

اس کی قبر کو سنگسار کیے جانے کے اسباب اور بھی بیان کیے گئے ہیں۔ بہر صورت اگر یہ بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ اصحاب فیل کے رجم کی ایک نظیر ہوگی اور نظائر پر قیاس کرنا زیادہ قرین عقل ہے۔ اسلام میں ابورغال کی قبر کو سنگسار کرنا بند کر دیا گیا ہے۔ کسی مخصوص قبر کو سنگسار کرنا اولاً تو اس کی رفعت اور بلندی کے منافی ہے، ثانیاً جب رمی جمرات واقعہ کی یادگار باقی رکھنے کے لیے کافی تھی تو پھر ابورغال کی قبر کو سنگسار کرنے کی رسم کو باقی رکھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

۱۵۔ اس تاویل کے اثرات و نتائج

رمی جمرہ کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اگر یہ صحیح ہے تو، خواہ یہ رمی چڑیوں کی جانب سے ہوئی ہو یا عربوں کے ہاتھوں، اگر یہ واقعہ اصحاب فیل کی یادگار ہے، جو مکہ اور اس مرکز ابراہیمی کے دشمن تھے جو توحید اور دین حنیفی کا سرچشمہ ہے تو لازماً اس سنت کی ادائیگی اور دعا کے وقت ہمارے احساسات و تاثرات اس سے بالکل مختلف ہوں گے جو شیطان یا مینڈھے کی رمی کے تصور کی حالت میں ہو سکتے ہیں۔

ان دونوں صورتوں کے فرق کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔

الف۔ رمی کے وقت جس شخص کا تصور یہ ہوگا کہ وہ شیطان کو کنکریاں مار رہا ہے، وہ اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ یا کوئی خاص جوش نہیں محسوس کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کنکریاں وہ ایک پتھر پر پھینک رہا ہے۔ اس سے نہ تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ شیطان کے فریبوں سے ہمیشہ کے لیے مامون ہو گیا اور نہ یہ ہی سمجھے گا کہ کم از کم کچھ ہی دنوں کے لیے اس کے فتنوں کو اس نے زخمی کر دیا ہے۔ اس تصور کا اثر اس کی نظر میں معوذتین یا لاحول یا اذان کے اثر سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے قدرتی طور پر دوسرے مناسک حج کی ادائیگی کے وقت جس جذبہ و جوش سے وہ اپنے آپ کو معمور پائے گا، اس رسم کی ادائیگی کے وقت اس جوش و جذبے سے اس کا سینہ بالکل خالی ہوگا۔ خصوصاً مینڈھے کے بھاگنے کا قصہ اور اس رمی کو اس کی یادگار سمجھنا تو جھوٹ ہونے کے علاوہ انتہائی لغو بھی ہے۔ فصل کے شروع میں ہم اس کی حقیقت بے نقاب کر چکے ہیں۔

ہاں اگر اس رمی کو واقعہ اصحاب فیل کی یادگار سمجھا جائے تو اس صورت میں ہمارے تصورات کا رخ کا بالکل دوسرا ہوگا۔

اور اس وقت قدرتاً ہمارے احساسات و تاثرات کی کمیت و کیفیت بھی بالکل مختلف ہوگی۔ ہم ایک ستون پر چند کنکریاں مار کر اس عظیم الشان نصرت الٰہی کو یاد کریں گے، جو اس کے مقدس گھر کے پاسبانوں کے لیے مخصوص ہوئی اور اس یاد سے ہمارے اندر جو جوش پیدا ہوگا اس کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یاد کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے دست تصرف نے ہمارے دشمنوں کے تمام داؤ بیکار کر دیے۔ ان کی عظیم الشان جمعیت اس نے پارہ پارہ کر دی۔ یہ تصور دنیا کے ایک عظیم ترین واقعہ کا تصور ہوگا۔ یہ تصور ہماری قوت ارادی کا شیرازہ بندی کرے گا۔ اس سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ سر و سامان کی قلت ڈرنے کی کوئی چیز نہیں ہے اصل سلاح کار خدا کا بھروسہ ہے۔ اس کی غیبی فوجیں ہماری بے سر و سامانی کے باوجود ہمارے دشمنوں پر ہم کو فتح دلا سکتی ہیں۔ ہر حال میں اس کے فضل اور اسی کی نصرت کی امید ہونی چاہیے۔ اس تصور کی بدولت ہم اپنے آپ کو مجاہد سمجھیں گے، جو ظاہری اسلحہ کے ذریعہ نہیں بلکہ قوت ارادی کے ہتھیاروں اور اللہ اکبر کی تکبیروں سے دشمن کی فوجوں کو سنگسار کر رہا ہے[1]۔

اس تصور کے تحت رمی کے بعد جب ہم دعا کے لیے کھڑے ہوں گے تو ہماری یہ دعا بھی مجاہدین کی دعا ہوگی۔ اس وقت سب کی قوت ارادی کا مرکز ایک ہی ہوگا۔ ایک جماعت کی جماعت جب اپنے دلوں کے ایک ہی مرکز عبدیت و نیاز کی طرف جھک جاتی ہے اور کسی ایک ہی آرزو کے لیے سب کی دعائیں اور التجائیں متحد ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس وقت ضرور متوجہ ہوتی ہے۔ نماز باجماعت اور نماز استسقاء میں یہی حقیقت مضمر ہے۔

علاوہ بریں یہ دعا ہم کو اس جماعت سے بالکل علیحدہ اور ممتاز کر دیتی ہے جن کا محور نظر صرف قوت ارادی کی جمع و تشکیل ہوتا ہے۔ مثلاً جادوگر اور بت پرست۔ گویا جس مقصد کے لیے ہم رمی جمار کرتے ہیں۔ یہ دعا اس کی تصحیح و تکمیل کرتی ہے۔

۱۶۔ حج سرتاسر مشق جہاد ہے

قربانی میں چوپایہ کا ذبح کرنا درحقیقت ذبح نفس کی علامت ہے۔ یہ قربانی ایک فدیہ ہے۔ گویا ایک چوپایہ کے عوض ہم اپنی جان چھڑا لیتے ہیں۔ بعینہ یہی حقیقت جہاد کی بھی ہے یعنی نفس کو ذبح کر کے اس کو جہنم کی آگ سے بچا لینا۔ پھر دیکھو حج کے تمام آداب و مناسک میں بالکل جہاد کی حقیقت جلوہ گر ہے۔ یہ روز کا کوچ و قیام اور عجلت کی نمازیں کیا ہیں؟ یہ بالکل فوجی مشق ترین ہے۔ ہر حج کرنے والا پورے یقین کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ یہ مرحلے کسی قائد ہی کی قیادت کے مقتضی ہیں۔ منازل پر حجاج کی حالت علانیہ فوجی نظم کی ضرورت کا یقین دلاتی ہے۔ یہ حالات بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے حالات سے مشابہ ہیں۔ ان کا کوچ اور قیام بالکل فوجی نظم کے ماتحت ہوتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سپہ سالار تھے، جو ایک طرف جنرل کی طرح فوج کی قیادت کرتے تھے دوسری طرف قاضی کی طرح بیٹھ کر فصل مقدمات کرتے تھے۔

مسلمان حج میں اپنے ارادۂ جہاد کی تصحیح کرتا ہے اور ان تمرینی مشقوں کو برداشت کر کے گویا اس امر کا اعتراف و اعلان کرتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے بالکل سر بکف ہے۔ اگر رمی کو رمی

---

[1] رمی کے وقت ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کی شرط اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ (مترجم)

شیطان کی یادگار مانو توحج کا یہ تمام فلسفہ بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے بعض طبیعتوں میں یہاں خدشہ پیدا ہو کہ یہ رائے بالکل نئی ہے۔ حج سے متعلق یہ بات نہ تو دوسروں سے سنی اور نہ خود اپنے ہی ذہن میں آئی کہ اس کو جہاد سے کوئی تعلق ہے۔ یہ تو محض ایک سادہ عبادت ہے، جنگ و جہاد سے اس کو کیا واسطہ! اسی لیے فرمایا گیا ہے لَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ۔ اس خدشہ کے جواب کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے جس کا یہ محل نہیں۔ اپنے مقام پر یہ بحث آئے گی۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں حوالۂ قلم ہوئیں۔